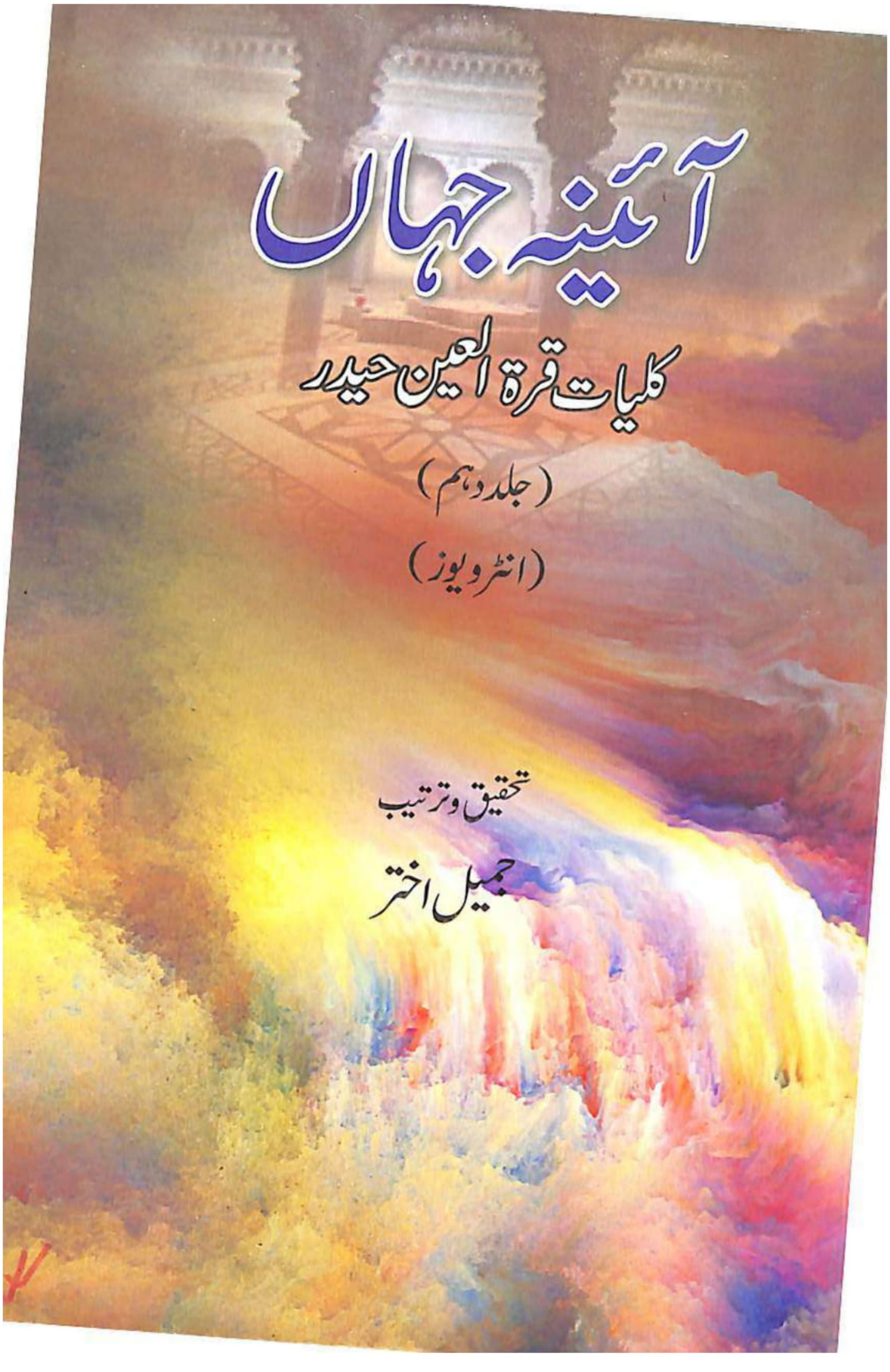
آئینہ جہاں
کلیاتِ قرۃ العین حیدر
(جلد دہم)
(انٹرویوز)
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

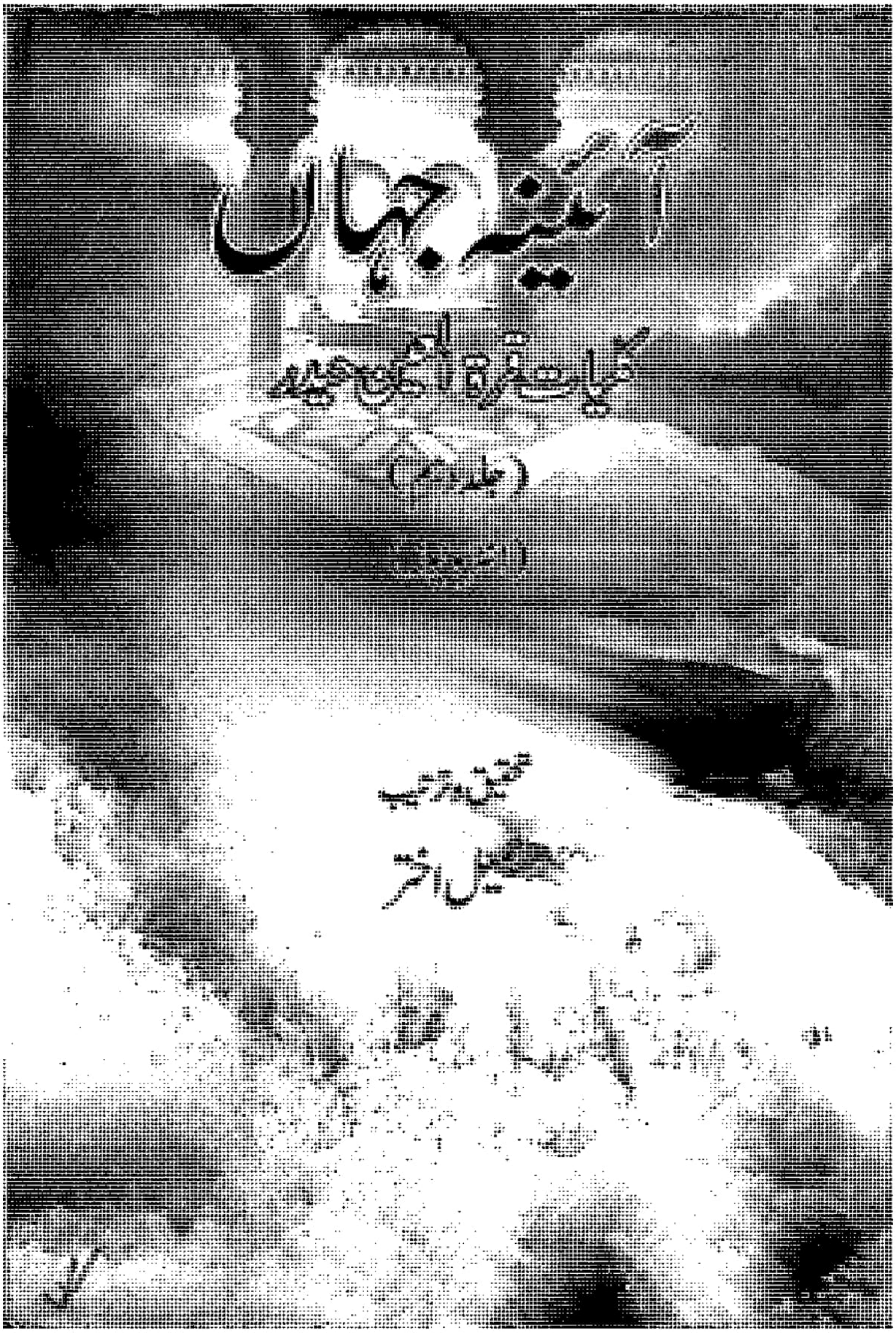

آئینہ جہاں
کلیاتِ قرۃ العین حیدر
(جلد دوم)
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

آئینۂ جہاں

کلیاتِ قرۃ العین حیدر

(انٹرویوز)

(جلد دہم)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/128 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1894

Aaina-e-Jahan

Kulliyat-e- Quratulain Haidar Vol. 10

By: Jameel Akhtar

ISBN :978-93-5160-128-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔ 8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔ میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔ میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

- دیباچہ — قرۃ العین حیدر — vii
- مقدمہ — xv

1. عادت پڑ گئی ہے نقادوں کو ادب میں حکمرانی کی — جمیل اختر — 1
2. ہمارے ادیبوں کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں — شفیع عقیل — 83
3. میرے افسانوں میں بہت ویرانی ہے — افتخار امام صدیقی — 91
4. کچھ ناقدوں کو زعم ہے کہ وہ ادب کے کنگ میکر ہیں — شمس الرحمٰن فاروقی — 119
5. میں بنیادی طور پر رومانٹک ہوں — ابوالکلام قاسمی — 127
6. نقادوں نے فکشن کو سراسر نظر انداز کیا ہے — سکریتا پال — 173
7. سرسید بڑے زبردست قسم کے ریفارمسٹ تھے — سہیل احمد خاں — 191
8. پاکستان ایک مقدمہ تھا جو قائد اعظم نے جیت لیا — حسن رضوی — 207
9. ہندستان میں اردو سیاست کا شکار ہو گئی — انیس الحق — 229

دیباچہ

جس فرد نے بحیثیت ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ، ریڈیو براڈ کاسٹر اور صحافی اپنے کالج کے زمانے سے طرح طرح کے مشاہیر کو انٹرویو کیا ہو جب خود اس کا انٹرویو لیا جائے تو اسے عجیب لگتا ہے۔ والد مرحوم کے ملاقاتیوں میں جو ہمارے یہاں آیا کرتے تھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ سب مشاہیر ادب تھے۔ آنند نرائن ملا، جگر و جوش و مجاز، علی عباس حسینی، سید سجاد ظہیر اور منشی دیا نرائن نگم وغیرہ۔ ہماری والدہ اس صدی کی اولین روشن خیال خاتون تھیں، لہٰذا نامور خواتین کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ ایسی صورت حال میں ہوتا ہے بچوں نے اپنی تربیت کے مطابق ان سب کا ادب تو بے حد کیا لیکن ان کی ادبی اہمیت کا کچھ احساس یا اندازہ نہیں تھا اور چونکہ یہ ایک بہت متقی قسم کا گھرانہ تھا، یہاں محافل نا ؤ نوش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دراصل آزادی سے قبل ہمارا معاشرہ زیادہ تر نہایت ہی صالح قسم کا معاشرہ تھا۔ ماہرین عمرانیات کو جاننا چاہیے کہ سیاسی زلزلے نے ذہنوں کو بھی کس طرح اور کس حد تک متاثر کیا کہ ہم اچانک ایک صارفی دور میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک جو آزادی سے چند سال قبل ہی شروع ہوئی تھی اسی سرعت کے ساتھ معدوم ہوئی، ان ساری تبدیلیوں کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا۔ یہ واقعہ

ہے کہ تخلیقی ادب کرائسس کے زمانوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ مصوروں اور موسیقاروں کو پرامن زمانوں کی ضرورت ہے۔ قلم کار کا دماغ ہی اس کا اسٹوڈیو بھی ہے اور جلسہ گھر بھی۔ اسے اپنے سامنے جیتے جاگتے حاضرین اور سامعین کی بھی ضرورت نہیں وہ تنہائی میں اپنا کام کرتا ہے۔ اسی تنہائی سے اپنے پیغامات دنیا کو بھیجتا رہتا ہے اور ایک دن خاموش ہو جاتا ہے۔ لکھنا ایک بے حد انفرادی عمل ہے لیکن اسی کے ذریعے لکھک اجتماعی زندگی میں اپنا اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے دور کی سیاسی اور دوسری تحریکوں کا اثر قبول کرتا ہے یا ان سے الگ بھی اپنی ایک راہ بناتا ہے۔ بعض دفعہ یہ راہ بالکل غیر ارادی طور پر بنتی ہے مثلاً جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ترقی پسندی کے عروج کا دور تھا، بیشتر ادیبوں نے سطحی مارکسیت کو اپنے اوپر اوڑھ لیا تھا۔ ڈگر سے ہٹ کر جو بھی چلا وہ رجعت پسند۔ مجھے اب تک یاد ہے اور میں اس کا پہلے بھی ذکر کر چکی ہوں۔ چونکہ جو باتیں بہت دکھی کرتی ہیں وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ میرے دو کزن جو انڈین پولس کے ایک اعلیٰ افسر کے بیٹے تھے، یہ دونوں بھائی زبردست سرخے بن گئے تھے۔ ایک دن وہ ایک ضخیم کتاب لے کر آئے جس کا گرد پوش سرخ رنگ کا تھا۔ کتاب کا عنوان تھا 'ہل کے سایے میں'۔ اندر اس وقت کے تمام نامی گرامی ترقی پسند اہل قلم کے افسانے شامل تھے۔ دیباچہ کرشن چندر نے لکھا تھا جس میں انھوں نے 'میرے بھی صنم خانے' کا تذکرہ کیا تھا جو ان ہی دنوں چھپ کر آئی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس ناول میں ڈرائنگ روم، تعلقہ داروں اور ڈنر پارٹیوں وغیرہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ مجھے اصل الفاظ تو یاد نہیں مطلب یہی تھا۔ مجھے یہ پڑھ کر بہت صدمہ ہوا اور تعجب بھی کہ اتنے بڑے بڑے ادیب اتنی سطحی بات بھی کر سکتے ہیں اور وہ افسانے کے متن کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ میں اس وقت بہت کم عمر تھی لیکن مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ ادب میں اب بھیڑ چال زیادہ ہو گئی ہے۔ انفرادی آوازوں کی گنجائش رہی ہے نہ اہمیت، لیکن میں لکھتی رہی چونکہ یہ میرا ایک پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایک بہت ہی بچکانی متھ طبقاتی ترجیحات کی بھی تیار کی گئی جس میں ایک طبقے کی بالادستی کا تذکرہ تھا، اور ان کی موٹر کاروں اور پارٹیوں کو ہدف ملامت بنایا جاتا تھا لیکن 1956 میں جب میں بمبئی گئی تو میں نے ان ہی اہل قلم کو فلم انڈسٹری میں شمولیت کی وجہ سے موٹر

کاروں اور ڈنر پارٹیوں والی زندگی بڑے طمطراق سے گزارتے دیکھا۔

ہماری چنداں ممانی اکثر کہا کرتی تھیں اے ہے میں نے فلاں بات سنی یا فلاں چیز دیکھی تو میں قائل ہوئی۔ چنانچہ میں بھی بمبئی میں ان اہل قلم کے دوہرے معیار کو دیکھ کر بہت قائل ہوئی لیکن میرے دیکھتے دیکھتے زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے۔ وہی نامور کامریڈ جو بات بات پر ٹاپ بورژواژی کا تذکرہ استہزائیہ انداز میں کرتے تھے اب انھوں نے کامریڈوں کی یہ اصطلاحات استعمال کرنی بالکل ترک کر دی اور اس دن تو مجھے بہت ہی حیرت ہوئی جب ایک نامور ترقی پسند ادیبہ نے مجھ سے فخریہ کہا کہ ان کی بیٹی کو اس کے منگیتر نے ہیرے کی انگوٹھی دی ہے جس کی قیمت بیس ہزار روپے ہے۔

تو ہمارے یہاں ترقی پسندی کا یہ غلغلہ دال چاول کا وقتی ابال ثابت ہوا۔ دراصل چند دانش وروں، یونیورسٹی کے طالب علموں اور اہل قلم کے انقلابی مضامین یا خیالات کسی ملک میں انقلاب نہیں لا سکتے یا سارا ہندستان اہالیان کیرالہ یا بنگال کی طرح پڑھا لکھا اور باشعور ہو تو تان آ کے ٹوٹی تعلیم پر اور فی الحال تعلیم کا رنگ کیسری ہوتا جاتا ہے... پس چہ باید کرد....

گزشتہ برسوں میں میرے جو انٹرویو لیے گئے ان سے بہ سرعت بدلتے ہوئے حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ میں پہلے بھی یہ کئی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ ہمیں اپنا موازنہ مغرب یا جاپان کے اہل قلم سے نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں کا ادیب ایک تعلیم یافتہ پبلک کے لیے لکھتا ہے ان کے یہاں آبادیاں بہت کم ہیں اور تعلیم بہت زیادہ... ہمارے یہاں آبادی ایک ارب تک پہنچ گئی ہے اور تعلیم آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بہت ہی خوش ہو کر نیوکلیئر بم بھی بنا لیا ہے۔ یہ صورت حال جتنی دہشت ناک ہے لوگ اس سے اتنے ہی بے پرواہ ہیں۔ پہلے ہندستان کے ادیب و شاعر چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے بطور احتجاج سڑکوں پہ نکل آتے تھے وہ نسل یا تو خاموش ہو گئی ہے یا اب دنیا ہی سے رخصت ہونے والی ہے۔ ان کی جگہ تیزی سے ایک جنگجو اور منفی قسم کے جارحانہ خیالات والی نوجوان پیڑھی سامنے آ رہی ہے۔ ہمارے اہل دانش نے ابھی اس انتہائی خطرناک صورت حال کا بھی شاید باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ایسے موقع پر ادب،

آرٹ، فلسفہ یا ان کی خدمت عجب مسخرے پن کی بات معلوم ہوتی ہے۔ فرقہ پرستی کا جنون جس حد تک لوگوں پر طاری ہو چکا ہے اس کا بھی ہمیں صحیح اندازہ نہیں ہے۔ طوفان نوح بڑھیا کے تنور سے نکلے گا؟

میں نے آج سے مدتوں قبل ایک سرسبز، پرفضا، پرسکون، دلآویز مقام کی سیر کی جسے اجودھیا کہتے ہیں۔ میں ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد اپنے ماموں کے یہاں فیض آباد گئی ہوئی تھی جہاں وہ چھاؤنی میں انڈین آرمی کے ایک میجر کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں تعمیر کی ہوئی ان وسیع وعریض نیچی کرسی والی کوٹھیوں کے گرد ایک سے ایک خوبصورت لان اور باغات لہلہا رہے تھے۔ ایک روز ہم لوگ اجودھیا گئے اور رام مندر دیکھا۔ باہر ایک بے حد گھنے چھتنار برگد کے نیچے چبوترے پر ایک ملاحی اطمینان سے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کے ان کے پاس ایک پنڈت جی بھی آ گئے۔ دونوں کو سیاحوں سے بخشش ملنے کی امید تھی۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ مندر میں تالا پڑا تھا یا نہیں۔ بہر حال وہ ایک نہایت پرسکون اور پرفضا مقام تھا۔ ایودھیا، اودھ، رام لکشمن اور سیتا کا دیس۔ میرا بچپن مشرقی اضلاع میں گزرا جو رامائن کی سرزمین ہے جہاں ہر تیسرے آدمی کا نام رام اور تیسری عورت کا نام سیتا ہے۔ ہماری کوٹھی کے مالک سیٹھ سیتارام تھے جو شہر کے اندر ایک تنگ وتاریک مکان میں رہتے تھے اور ہمارے ایک پنکھا قلی کا نام بھی سیتارام تھا۔ وہاں ہنود ایک دوسرے کو رام رام کہہ کر سلام کرتے ہیں۔ رام لیلا کے موقع پر دو لڑکے چہرے پر سفید پاؤڈر لگا کر رام اور لکشمن بنتے تھے اور ہمارے ہندو معززین شہر جا کر ان دونوں کو پرنام کرتے تھے۔ رام لیلا کے کرداروں کا روپ دھارن کرنے میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہیں پر ہمارے ڈرائیور نے ایک لطیفہ بیان کیا کہ ایک بار کارڈ بورڈ کے پہاڑ کو بڑھئی نے کیلوں کے ذریعہ نہایت سختی سے جڑ دیا تھا۔ کئی لڑکے ہنومان جی بنے تھے۔ ان سب نے باری باری وہ پہاڑ اکھیڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ جب ایک مسلمان لڑکے کی باری آئی جو ہنومان جی بنا تھا اس نے آگے جا کر زور سے ایک نعرہ لگایا 'یا علی' اور پہاڑ اکھیڑ دیا۔ بہت تالیاں بجیں۔

چنانچہ 'یا علی' پکارنے والے ہنومان جی کی یہ کلچر بہت اچھی طرح پھل پھول رہی تھی مگر 1947 میں لوگ گڑبڑا گئے۔ پھر بھی ہمارے اضلاع کے دیہات میں یہ تہذیب موجود ہے ابھی تین چار سال قبل میں نے اودھ کے ایک گاؤں میں آدھی رات کے بعد نہر کے کنارے کنارے بیل گاڑیاں جاتی دیکھیں جن پر مرصع تعزیے لدے ہوئے تھے۔ محرم آنے والا تھا۔ یہ سارے تعزیے اہل سنت کے گھروں میں دس دن تک رکھے جائیں گے۔ یہ تعزیوں، پیروں، فقیروں اور درگاہوں اور رام لیلاؤں کی کلچر ہماری اصل کلچر ہے اور بڑی نعمت ہے اور اسے ہرگز ہرگز مٹنے نہیں دینا چاہیے۔ نہ یہ بدعت ہے نہ اوہام پرستی، نہ شرک، نہ بت پرستی، یہ محض ہمارے عوام کا تہذیبی سرمایہ ہے۔ جب اسپین یا اٹلی میں کورپس کرسٹی کے جلوس نکلتے ہیں تو ہم پر بہت رعب پڑتا ہے چونکہ وہ گوروں کا مذہب ہے۔ یا جب ویسٹ منسٹر ایبے کے اندر تاج پوشی سے پہلے لاٹ پادری ملکہ الیزابتھ کے سر پر تیل ڈال کر وہ قدیم عبرانی رسم ادا کرتا ہے جس کے ذریعے کنعام و فلسطین کے بادشاہوں کو جس کے بعد تخت نشیں کیا جاتا تھا تو آج کا انگریز لاٹ پادری یعنی Arch-Bishop of Canterbury ملکہ الزبتھ کے سر پر ایک چمچہ تیل انڈیلتے ہوئے مطلق نہیں شرماتا اور سر پر تیل سے مسح کر کے بادشاہ بنانے کی اسی رسم اور اسی لفظ مسح سے مسیح نکلا ہے یعنی مسح کیا جانے والا۔ ہمارے یہاں بھی مسح وضو کے فرائض میں شامل ہے۔ ان کی اور ہماری تہذیبوں کا منبع ایک ہے۔ یعنی ہمارا ابا اور ان کا ایبے (Abbey) اور ایبس (Abbess) بھی لفظ ابا پر مبنی ہے۔ دور حاضر کے اسرائیلی لیڈر کا نام ایبان Eban تھا۔ مسیحی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہونے کے بعد تکلیف کی شدت سے چلا کر پکارا تھا ابا... ابا... لما سبقطنی یعنی ابا... ابا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ یعنی بہ الفاظ دیگر حضرت عیسیٰ اللہ میاں کو ابا کہتے تھے۔ یعنی یہی نظریہ تثلیث کی بنیاد ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ تو گویا جب برصغیر کے مسلمان گھرانوں کے بچے اپنے باپ کو ابا کہہ کر پکارتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ کے ہم زبان ہیں۔ لفظ کہاں سے کہاں تک کا سفر کرتا ہے۔ مذہبی نظریات اور تاریخی فاصلوں سے الفاظ کے معنی بدل گئے اور ان کی دنیائیں مختلف ہو گئیں۔

الزابتھ نام کو لیجیے۔ ایل ایلی الہی، اللہ قدیم عبرانی الفاظ ہیں۔ الزابتھ کے لغوی معنی ہوئے اللہ رکھی یعنی ایل—ایلی زبتھ...رکھنا، بیٹھنا۔ یعنی یہ الفاظ ہمارے الفاظ کی دنیا سے بہت قریب ہیں لیکن جس تمدن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں ہم سے وہ بہت مختلف مغربی تمدن ہیں۔ اسرائیل کے ایک وزیر کا نام ہی ابا، ایبان تھا۔ اب جو تمدن ابا کے نام کے ساتھ ہمارے آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ خالص ہندستانی (یا پاکستانی) ہے۔ لیکن ابا، ایبان لفظ وہی ہے اس سے منسلک دنیا بالکل ہم سے علاحدہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح لفظوں کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جو الفاظ یا اصطلاحات ہمارے لڑکپن میں مستعمل تھیں وہ اب متروک ہو چکی ہیں۔ ہمارے یہاں کار کو موٹر اور گیراج کو موٹر خانہ کہا جاتا تھا۔ کوٹھی میں پینٹری یا آبدار خانہ ہوتا تھا، باہر احاطے میں موٹر خانہ۔ حال ہی میں، میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ تمھارا موٹر خانہ کس طرف ہے تو ہنسنے لگی اور بولی موٹر خانہ کیا چیز ہے؟ ہمارے یہاں بیرے کو سردار کہا جاتا تھا وہ سارے ملازموں کا ہیڈ تھا۔ ہمارے آخری سردار غازی پور میں عبدل تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی کلچر کے پروردہ تھے اور تھوڑی بہت کچن انگلش بھی جانتے تھے۔ جب لنچ یا ڈنر کے لیے بلاتے تو فرماتے کھانا میز پر، یہ فقرہ بھی کمپنی کلچر کی باقیات میں شامل تھا اور انھوں نے خود ہی لطیفہ بیان کیا تھا کہ ایک تازہ وارد انگریز افسر نے سمجھا کہ میز پر کا مطلب ہے تیار ہے تو اس نے عبدل کو آواز دی گھوڑا گاڑی میز پر؟ یعنی تیار ہے؟ یہ 'کوئی ہے' کی کلچر تھی۔ خود میں نے بچپن میں اپنے ایک بزرگ عزیز کو کوئی ہے پکارتے سنا یا وہ محض آواز دیتے تھے یہاں آؤ۔ ملازم کا نام لے کر پکارنا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔ انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے اضلاع میں اپنی سول سروس کے عہدہ داروں کی جو کلچر تخلیق کی وہ ساری دنیا میں منفرد تھی۔ ڈچ، جرمن، فرنچ، نو آبادیوں کی کولونیل آقاؤں نے اپنی محکوم ایشیائی اور افریقی آبادیوں کو باقاعدہ ان پڑھ اور جاہل رکھا جبکہ ایک ہندستانی اس زمانے میں ممبر آف پارلیمنٹ بن گیا اور آکسفورڈ اور کیمبرج ان کے لیے گھر آنگن بن چکے تھے۔ انگریزوں کی یہ کشادہ دلی ان کی لبرل ازم کے نظریے کی مرہون منت تھی۔ بے شک انھوں نے یہاں نسل پرستی کا بھی خوب خوب مظاہرہ کیا، بہت سے طعام خانوں اور ریل کے ڈبوں پر لکھا ہوتا تھا فار یورپین

اونلی، لیکن اس کے باوجود وہ تاریخ کے سب سے زیادہ روشن خیال کولونیل آقا ثابت ہوئے۔ انگریزی تعلیم نے ہماری دنیا بدل دی۔ بقول ملک راج آنند اگر شیلے اور کیٹس نہ ہوتے تو ٹیگور بھی نہ ہوتے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ محکوم اقوام آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے سابق آقاؤں کی زیادتیاں تو یاد رکھتی ہیں ان کی نیکیاں بھول جاتے ہیں۔ یہی مغلوں کے ساتھ ہوا۔ مغلوں نے جو نیکیاں اس ملک کے ساتھ کیں انھیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ انھوں نے طرز حیات میں جو نفاستیں یہاں متعارف کیں ان کو بھی کوئی نہیں پہچانتا۔ اعلیٰ تہذیب کے جو اسباق انھوں نے پڑھائے وہ بھی بھولتے جارہے ہیں۔ چمن بندی، آداب نشست و برخاست، دستر خوان پر ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کرنا، ماں کو تو کے بجائے آپ سے مخاطب کرنا۔ ماں تو کیا کہہ رہی تھی اور ای جان آپ کیا فرما رہی تھیں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ فرقہ جو اپنی کلچر کی وجہ سے ممتاز تھا اب ناساعد حالات کا شکار ہو کے اپنی بدتمیزیوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے یا اپنے مذہبی جوش کے جا و بے جا اظہار کے لیے۔ دو مرتبہ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ ایک صاحب چلتی ٹرین کی کوریڈور میں بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں اور سارے میں پانی بہا رہے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے مسافروں کا آنا جانا مشکل ہو گیا کیا وہ تیمم نہیں کر سکتے تھے؟ ناساعد حالات کیا رفتہ رفتہ انسانوں کا آئی کیو بھی بتدریج کم کرتے جاتے ہیں۔ مجھے اس دن بڑی کوفت ہوئی جب ایک صاحب کی کسی بے وقوفی کی وجہ سے اسپرنٹ کے دفتر میں میرے مہاراشٹرین رفیق کار نے مجھ سے کہا فکر کی کوئی بات نہیں ہم اس کیونٹی کو کلچر سکھا دیں گے۔ عہد نامہ قدیم میں ایسی ایسی آفاقی صداقتیں موجود ہیں تعجب ہوتا ہے کہ ولادت مسیح سے ایک ہزار سال قبل بھی دنیا کے حالات وہی تھے جو آج ہیں اور اس میں کئی جگہ ان لوگوں کا ذکر آیا ہے جو پہلے سیاسی اقتدار کے مالک تھے اور اب وہ پانی بھرنے والے اور لکڑیاں چیرنے والے بنا دیے گئے۔ Drawers of Water and hewers of wood یہ قدیم واقعہ تاریخ میں بار بار دہرایا گیا ہے اور آج بھی ہمارے اپنے ملک میں اس کے مناظر موجود ہیں۔

سنہ 1953 سے لے کر آج تک جتنے انٹرویو اخبارات و رسائل کے لیے کیے گئے ان میں

سے چند اس کتاب میں شامل ہیں۔ بی بی سی لندن، ماسکو، تاشقند، تہران، ہانگ کانگ، سڈنی، پاکستان اور امریکہ کے مختلف شہروں میں ریڈیو یا پریس کے لیے جو انٹرویو کیے گئے ان کی شمولیت ممکن نہیں تھی پھر بھی جمیل اختر صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے جانے کہاں کہاں سے کھود کر یہ انٹرویوز نکالے جس کے لیے ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے۔ دراصل اس قسم کی ادبی مہم کا بیڑا اٹھانا فرد واحد کی اپنی ہمت پر منحصر ہے۔ مولف کی محنت اور اردو ادب کے موجودہ سیاق و سباق پر ان کی گہری نظر یقیناً قابل تعریف ہے۔

قرۃ العین حیدر
19 اکتوبر 2001

سی 140 جل وہار
نوئیڈا، سیکٹر-25

مقدمہ

قرۃ العین حیدر کی کلیات سازی کا کام میں نے ان کی اجازت سے ان کی حیات میں ہی شروع کر دیا تھا۔ افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل تین جلدیں اور ایک نیا افسانوی مجموعہ 'قندیل چین' ان کی حیات میں ہی شایع ہو چکا تھا لیکن عینی آپا اس کی خوشی نہ دیکھ سکیں کتاب شایع ہونے کے فوراً بعد خرابی صحت کی وجہ سے داخل اسپتال ہوئیں اور پھر جاں بر نہ ہو سکیں اور اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ بلکہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر کام کرتا رہا۔ اس لیے کہ کوئی ادارہ پروجیکٹ مکمل ہونے پر کتاب تو شایع کر دیتا ہے لیکن بنیادی ماخذ کی تلاش و جستجو کے لیے جو اصراف خطیر ہوتا ہے اس کا بار اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ اردو ادب کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرد واحد کے محدود وسائل سے کوئی بڑی امید کرنا بعض وقت مایوسی کا سبب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی فرد واحد انجمن اور ادارے سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے اور اس کا یہی نادر کارنامہ فرد کی انفرادیت کو ادب کے افق پر اجاگر کر کے اس کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے اور ادبی تاریخ ایسے منفرد جیالوں سے جگمگا رہی ہے۔ ورنہ اردو ادب کی دگرگوں صورت حال میں اس کی ساری وراثت تہہ و بالا ہو جاتی اور سارا سرمایہ تہہ تیغ ہو جاتا۔ لیکن

ادبی ذوق وشوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیرالعقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق وتنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی پس ماندگی کو دور کیا جا سکتا اور اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تحقیق وتنقید کے لیے فضا سازگار ہوتی۔ گفت وشنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو مجتمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی محافظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے وافراد کیا اپنی آنکھیں خشک کرلیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو پچاسوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کر سکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنفہ نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام ونمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی، آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی المنا کی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔ عبرت ناک... عبرت ناک... بسروم دھم دھم...

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

قرۃ العین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پرفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہلِ نظر نے اپنے عہدِ رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔''

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوحہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان کمپنی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذرِ آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرا نشیب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پرونے کی ٹوکری بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ

کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں پشکن کے گھوڑے کی
ایال کو جس چوبی کنگھے سے سنوارا جاتا تھا وہ کنگھا بھی محفوظ ہے۔ جس
زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوب کیا، اس وقت
تک شاید ان میں سے کوئی بندہ روس نہیں گیا تھا۔
چنانچہ عزیز بانو کا مکان بھی لکھنؤ کے چند اور مکانات کی طرح
National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ
رائے دیتی مگر وہ خود ہی غائب ہو گئیں۔"

قرۃ العین حیدر کا مکان بھی نیشنل ہیریٹج میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ تاریخ کی یہ درد ناکی شاید انسان کا مقدر ہے۔ تاریخ کے بہاؤ اور وقت کی جبریت کا قہر جب سونامی کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سب کچھ تاخت و تاراج کر دیتا ہے اور انسان محض ایک بے بس تماشائی کی طرح حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس عبرت ناک منظر پر چند آنسو نکل بھی آتے ہیں اور کبھی استعجابی شدت سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی اس بے بسی اور درد ناکی کی گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر حقیقت کا ادراک کرانے والی خاتون کو کیا پتہ تھا کہ صدیوں سے دہرائی جانے والی اس کہانی کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

آج قرۃ العین حیدر کی برسی پر چراغاں کرنے والے بھی نہیں رہے۔ عقیدت کے دو پھول چڑھانا تو دور کی بات ہے۔

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

کیا قبرستان کا یہ سناٹا کبھی ادبی سرگوشیوں میں تبدیل ہو کر انھیں خراج عقیدت پیش کر سکے گا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

اردو ادب کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت مصنفہ لحد میں ضرور خوابیدہ ہے لیکن ان کے چاہنے والے انھیں اتنی جلد فراموش کر دیں گے، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت اور سچائی بڑی جابر چیز ہے۔ جب سامنے آتی ہے تو بھرم تار تار کر دیتی ہے۔ آج وہ بھرم تار تار ہو گیا جو داستان طراز تھی۔ وہ خود داستانِ عہد گل ہو گئی۔ تاریخی بصیرت کا رفیع الشان احساس دلانے والی تخلیقی ہستی کا اس طرح ناپید ہونا دوسروں کے لیے زبردست عبرت کا مقام ہے۔ کیا وقت اس حیرت و استعجاب کو کم کر سکے گا؟ ہمیں اس لمحے کا انتظار رہے گا۔

آج قرۃ العین حیدر دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس تاریخی قبرستان میں جہاں انھوں نے علم و ادب کی عظیم المرتبت ہستیوں، دانشوران ملت اور بانیان جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان پناہ لی ہے، سے باہم مشاورت ضرور کر رہی ہوں گی کہ آخر یہ ستم ظریفی ہماری قوم میں ہی کیوں ہے۔ تاریخی حافظ کی عظیم المرتبت ہستیوں کے درمیان رہ کر بھی اس قدر بے بسی کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قوم اپنے لعل و گہر کی عظمت کو کب پہچانے گی؟ کب انھیں عزت و توقیر ملے گی؟ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ان لوگوں کے درمیان میں کبھی فراموش نہیں کی جاؤں گی۔ میں نے اپنا سارا ادبی سرمایہ اس دانش گاہ کو اس لیے بخش دیا تھا کہ کم از کم ہر برس یہ لوگ میری لحد پر عقیدت کے دو پھول ہی ڈال کر میری عزت افزائی کریں گے۔ لیکن یہ تو میرا میوزیم (آرکائیو) بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے نام کا گیٹ بھی وہاں بنایا جہاں علم و ادب کی ہستیوں کا گزر ہی نہ ہو۔ بھلا اسٹیڈیم سے متصل گیٹ سے میرے نام کی کیا نسبت؟ دانش گاہ کا مین گیٹ جہاں غالب غزل سرا ہیں اگر میرے نام کا ہوتا تو شاید کچھ مناسبت بھی معلومات ہوتی کہ میں وہاں سے شعبۂ اردو پر بھی نظر رکھ سکتی اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی، پھر تو میری روح بھی خوش ہوتی اور میری ہستی کا وجود اس طرح ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

تاریخی بصیرت کی حامل ہستیوں کا یہ حشر عبرت ناک ہے۔ غالب کی حویلی کی باریابی کے لیے صدیوں تک تحریک چلی پھر حکومت نے موقع پرستی کی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے واگذاری کی بھی، وہاں تو معاملہ غاصبانہ قبضے کا تھا اس لیے واگذاری ہو گئی۔ یہاں تو مکان

فروخت کر دیا گیا ہے جس کی واگذاری ممکن ہی نہیں۔ تاریخ کی بوالعجیاں بھی عجیب و غریب ہیں۔ عظمت رفتہ پر تاسف کرنے اور آنسو بہانے والی ادیبہ ڈھائی ہزار سالہ ہندستانی تاریخ کے وقوع کو کھنگالنے کے بعد کف افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تو میرا ماضی، میرا عظیم الشان ماضی، میری عظیم الشان روایات کی یاد کر کے اس پر آنسو بہا کر دل کو مطمئن کر لیا۔ یہاں تو ماضی کی عظیم الشان روایات سے حال کا عظیم الشان رشتہ باقی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن زر پرستی کی حوس میں، ہندستانی تہذیب و ثقافت کی بقاو تحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کے صلے میں انھیں انعام بھی کیا دیا کسی دوسرے نے نہیں خود ان کے اپنوں نے جو ان کے جذبات اور ان کی عظیم الشان تخلیقی وراثت کی قدر و قیمت کو پہچان نہ سکے جو کل تک ہماری عظمتوں کی پہچان تھے اور جس پر انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی اور آج خود ان کے اپنوں نے ان کی وراثت کی پامالی کر کے ان کی عظمتوں کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو لعنتوں کی بارش ہوگی، مگر کس پر۔ یہ وہ مقام عبرت ہے جس سے ہر کسی کو سبق لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر پر میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو زندگی کے ان کے مشن کے تحت میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہوں۔ اور میں قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی عظمت کو خواہ اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو داغ دار کرے۔ دنیا ان کو عزت کے منڈولے میں بٹھانا چاہتی ہے اور اپنے ہیں کہ قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہاں تو بات کلیات سازی کی چل رہی تھی اور موضوع بہک کر کہاں سے کہاں چلا گیا۔ سوال وراثت کی حفاظت کا تھا۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس بارگراں کو اٹھا تو لیا ہے لیکن کیا وسائل کے بغیر کئی ملکوں میں بکھری ان کی تحریری وراثت کو مکمل طور پر سمیٹنا ممکن بھی ہو سکے گا۔ میرے خیال میں اس کا سیدھا سچا جواب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ زندگی میں کسی پر اتنا اعتماد آپا نے نہیں کیا جتنا مجھ پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات کی تدوین جیسے مشکل کام کے لیے خود سے میرا انتخاب کیا اور میں نے ان کی زندگی میں اس اعتماد کو وقار بھی عطا کیا۔ اور کلیات کی تین جلدیں سجا سنوار کے انھیں پیش بھی کر دیں۔ اب سوال آگے کا ہے۔ مجھے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہو کر مجھ سے

سوال کرتی ہیں کہ باقی بچا کام کب ہوگا؟ بس یہی بات مجھے کچوکے لگاتی ہے۔ میں نے آپا سے وعدہ کرلیا ہے کہ مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا۔

ان کے انتقال کو آٹھ سال بیت گئے۔ اس بیچ میں تنکا تنکا جمع کرتا رہا۔ اب جا کر اتنا کچھ جمع ہوسکا کہ آپا کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ شاید میری یہ کاوش علم وادب کے قدردانوں میں ان کا اعتماد مضبوط کر سکے گی۔ یہ کوشش فرد واحد کی ضرور ہے لیکن یہ کام انسان کو ایک انجمن، ایک ادارہ بنا دیتا ہے۔ خدا کرے میری یہ سعی جمیلہ انھیں شہرت دوام عطا کر سکے اور علم وادب کے سرمایۂ افتخار میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہو۔

کلیات کی پہلی چار جلدیں افسانے، ناولٹ اور ایک نیا افسانوی مجموعہ قندیل چین پر محیط ہیں۔ اب کلیات کی پانچویں جلد سے تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

Vol. - 5 : رپورتاژ
Vol. - 6 : رپورتاژ
Vol. - 7 : مضامین
Vol. - 8 : مضامین
Vol. - 9 : خاکے
Vol. - 10 : انٹرویوز
Vol. - 11 : انٹرویوز

اس کے علاوہ ان کے تراجم، بچوں کی کہانیاں، صحافتی مضامین، فلم ریویو، کتابوں پر تبصرے، خطوط اور دیگر دوسری چیزیں۔ یہ سب قصہ اگلے پڑاؤ کا ہے۔ سلسلہ تلاش وجستجو جاری ہے۔ تحقیق اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ فی الوقت درج بالا سات جلدیں پیش خدمت ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے انٹرویوز کا یہ مجموعہ میری تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان کو یکجا کرنے کے لیے اخبارات ورسائل کے فائلوں کی گرد جھاڑنی پڑی اور برسوں کی جہاں گردی اور دشت نوردی کے بعد یہ چیزیں ہاتھ آئی ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا کہ تمام چیزیں حاصل ہوگئی ہیں، میرے خیال میں درست نہیں ہوگا۔ ابھی بھی بہت سی چیزیں ایسی ہوں گی جہاں تک میری رسائی کوششوں کے باوجود نہیں ہوسکی ہوگی۔

ان انٹرویوز کو جمع کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ محقق کو تلاش وجستجو کے جاں کاہ

مرحلوں کی اذیت ناکی سے نجات دلائی جا سکے اور ان کا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔ اس لیے کہ قرۃ العین حیدر دورِ حاضر کی سب سے بڑی فکشن نگار قرار پا چکی ہیں اور ان پر تحقیق کا سلسلہ ہندو پاک کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی شروع ہو چکا ہے۔ کچھ تحقیقی کاوشیں مکمل بھی ہو چکی ہیں اور کچھ کتابیں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ لہٰذا مستقبل کے محقق کی پریشانیوں کو کم کرنے کی یہ ایک حقیر سی کاوش ہے۔

انٹرویوز میں چونکہ مصنف کے ذاتی خیالات اور نقطہ نظر کا اظہار اور اس کی وضاحت ہوتی ہے اس لیے تحقیق میں اس کی بڑی اہمیت ہو جاتی ہے۔ بہت سے مشکل مسئلوں کا آسان حل یہاں نکل آتا ہے۔ بہت سے الجھے ہوئے نکتے سلجھ جاتے ہیں۔ حالاتِ زندگی اور تخلیقی کاوشوں کی بہت سی وضاحتیں یہاں مل جاتی ہیں۔ تخلیقی سفر کی داستان، تخلیقی محرکات، فلسفہ زندگی اور فکر و فن پر نت نئے انداز میں، بہت سے ان سوالوں کا جواب فراہم ہو جاتا ہے جو بعض وقت محقق کے ذہنوں میں ابھرتے تو ضرور ہیں لیکن جواب نہ ملنے کی صورت میں ادھورے اور تشنہ رہ جاتے ہیں۔

چونکہ انٹرویوز عموماً تین قسم کے سوالوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک تو ادیبوں سے ان کی شخصیت اور فن کے متعلق مختلف زاویوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسرے ادب اور عصری مسائل کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوتی ہے، تیسرے ادبی تحریکات اور ادب کی مجموعی صورتِ حال پر گفتگو کی جاتی ہے۔ کچھ قومی اور عالمی ادبی اور سیاسی تناظر میں بھی بات ہوتی ہے اس لیے کہ ادیب بالواسطہ نہ سہی بلاواسطہ ہی سہی ان معاملات سے ضرور تعلق رکھتا ہے اور اس کی فکر متاثر ہوتی ہے۔ اس طرح کبھی کبھی دلچسپ اور نئی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں، ادبی اور غیر ادبی تنازعات بھی جنم لیتے ہیں اور بعض ایسی اہم باتیں ہوتی ہیں جو ادبی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ عموماً سوالات وہی ہوتے ہیں جن سے عصری ادب کو سامنا ہوتا ہے۔ عصری مسائل کی نوعیت یکساں ہوتے ہوئے بھی مختلف الخیال اور مختلف النظریات ادیبوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں اور مختلف زاویوں سے اس پر روشنی پڑتی ہے لہٰذا عصری ادبی صورتِ حال اور عصری مسائل کی جتنی تفصیلی آگہی ہمیں انٹرویوز سے حاصل ہو سکتی ہے یا ہوتی ہے کسی اور طریقے سے

حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ انٹرویوز میں شاعروں، ادیبوں، فن کاروں اور دانشوروں سے فکر انگیز مکالمات کے ذریعہ وہ باتیں اگلوائی جاتی ہیں جن کا اظہار کسی مضمون یا مقالے یا نجی گفتگو میں بھی ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے انٹرویو فکر انگیز مکالمات پر مشتمل وہ ادبی دستاویز ہے جس کی اہمیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہوسکتی، بلکہ وقت گزرنے کے بعد اس کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

انٹرویوز کی اسی اہمیت کے پیش نظر میں نے قرۃالعین حیدر کے انٹرویوز کو یکجا کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی صورت دے دی۔ اس لیے کہ قرۃالعین حیدر کے نظریات، ان کی شخصیت اور فلسفہ زندگی پر جو تفصیلی معلومات ان انٹرویوز سے حاصل ہوتی ہے، خود ان کی تخلیقات اور تحریروں سے وہ روشنی فراہم نہیں ہوتی۔ وقت، تاریخ اور اپنی تخلیقی کاوشوں، فلسفہ زندگی پر جو فکر انگیز گفتگو قرۃالعین حیدر نے اپنے انٹرویوز میں کی ہے ان کی تفصیلات کہیں اور نہیں ملتی۔ ان پر تحقیق کرنے والا کوئی بھی محقق ان کے انٹرویوز کو پڑھے بغیر صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی ان کی تخلیقی کاوشوں کے بارے میں صحیح رائے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب میں شامل تقریباً تمام انٹرویوز ہندوپاک کے اہم ادبی رسائل واخبارات میں شایع ہوچکے ہیں۔ صرف شفیع عقیل ایڈیٹر 'جنگ'، کراچی کا انٹرویو ایسا ہے جو کہیں شایع نہیں ہوا ہے اور سب سے پرانا بھی ہے۔ شہزاد منظر مرحوم نے بھی جس وقت اپنا انٹرویو مجھے دیا تھا اس وقت وہ شایع نہیں ہوا تھا لیکن بعد میں وہ بھی شایع ہوگیا۔ شمیم حنفی کا انٹرویو انگریزی میں تھا اسے ترجمہ کیا گیا ہے۔ محمد صادق، راجندر اپادھیائے اور پرویز احمد کا انٹرویو ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ان تمام انٹرویوز پر روایتی قسم کے عنوانات تھے جیسے قرۃالعین حیدر سے بات چیت، ایک مکالمہ، ایک ملاقات وغیرہ۔ عنوانات مختلف اور اچھوتے ہوں اس خیال سے میں نے تمام انٹرویوز کے عنوانات کی بنیاد قرۃالعین حیدر کے چبھتے ہوئے جملوں کو بنایا۔ اس سے انٹرویوز کے عنوانات کی یکسانیت ختم ہوگئی اور چبھتے ہوئے عنوانات سے ایک نیا پن بھی آگیا۔ عنوانات اتنے

کھینچ ہیں کہ انھیں دیکھ کر انٹرویوز کو پڑھنے کی خواہش بے حس اور بے جان قاری میں بھی بیدار ہوگی، حساس قاری کی تو بات ہی الگ ہے۔

انٹرویوز کی تحقیقی اور تاریخی اہمیت مسلم رہے اس خیال سے ہر انٹرویو کے آخر میں رسالے کا نام اور ماہ و سال اشاعت درج کر دی ہے تا کہ سند رہے۔ قرۃ العین حیدر کے لاتعداد انٹرویوز ایسے ہیں جو ملک اور بیرون ملک کے مختلف ممالک میں ریڈیو اور ٹی وی چینلوں کے لیے ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ چونکہ یہ تحریری شکل میں موجود نہیں ہیں لہٰذا ان کی شمولیت ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ یہ تمام انٹرویوز بھی بے حد اہم ہیں لیکن ان کی دستیابی ایک بے حد مشکل مسئلہ ہے۔ اگر کبھی ممکن ہوا تو اس سمت میں پیش قدمی کی جائے گی۔ فی الحال اطلاعاً عرض ہے۔

'عادت پڑ گئی ہے نقادوں کو ادب میں حکمرانی کرنے کی' یہ عنوان راقم الحروف کے ذریعے لیے گئے انٹرویو کا ہے۔ یہ انٹرویو میری کتاب 'نوائے سروش' کی تیاری کے مرحلے میں 2001 میں لیا گیا تھا۔ ویسے ان تمام انٹرویوز کو پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا کہ یکساں نوعیت کے بہت سے سوالوں کے جوابات پر مصنفہ کا نقطۂ نظر شروع سے اب تک ایک ہی رہا ہے۔ زمانے میں انقلابی تبدیلیوں کے رونما ہونے کے باوجود افراد و اشخاص کے رویوں میں ان کی منجمد فکر اور جامد سوچ کی وجہ سے رشتوں میں برتاؤ کی سطح پر جو ایک اڑیل رویہ رہا ہے اس نے سماجی ترقی کی راہ میں کافی رکاوٹیں کھڑی کی ہیں اور بہ سرعت تبدیل ہوتی ہوئی زندگی میں کافی اڑچنیں پیدا کی ہیں۔ زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کے دوہرے ماپ دنڈ نے سماجی سطح پر کافی گڑبڑی پیدا کی، سماج میں پھیلے کنفیوژن نے ایک انتشار کی صورت اختیار کر لی۔ یہ صورت حال کسی بھی ملک اور سماج کے لیے فال نیک نہیں کہی جا سکتی ہے۔ انتشار اور افراتفری کی یہ صورت حال ہمیں قرۃ العین حیدر کے فکشن میں ملتی ہے۔ ان کے کردار کنفیوژن کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ انتشار میں بھی مبتلا نظر آتے ہیں اور ایک افراتفری کی فضا ان کے شروع کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ سماج کے تھمتے حالات اور بدلتے رخ سے انسانی رویوں میں جو تبدیلی ہوئی بعد کی تخلیقات میں اس کے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں اور انسانی دکھ درد اور

کرب کی تاریخ نے جو کروٹ بدلی ہے اس کی دردانگیزی کو پوری شدت کے ساتھ قرۃ العین حیدر کی حسیت نے انگیز کیا ہے اور فن کے قالب میں ڈھال کر اردو فکشن کو ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔ تاریخ کے جبر کو جس صبر کے ساتھ انھوں نے اپنے فکشن کی بنیاد بنایا ہے، وہ انہی سے مختص ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے فکشن کے اس کمال کو ادب میں دوام حاصل ہو چکا ہے۔

سیاسی منظرنامے کی تبدیلی سے سماجی رویوں میں جو بدلاؤ آیا، افراد و اشخاص کے برتاؤ میں جو فرق پیدا ہوا اس نے انسانوں کی کہانی ایسی بدلی کہ جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ زمین تو زمین آسمان نے بھی ستم ڈھائے ہیں کیا کیا۔ اعلا د بالا سب ادنا د زیر ہوئے اور ذلت مقدر بنی، پستی کو بلندی نصیب ہوئی اور ادنا اعلیٰ بن گئے۔ زہے نصیب، قدرت کے سب کھیل نرالے ہیں۔ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔ مقام آہ وفغاں تو بہتوں کا مقدر بنا۔ اکثر نے نصیب کا لکھا سمجھ کر صبر کیا، خون کے آنسو بہا کر رہ گئے۔ ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنے سے درد کی ٹیس کے سوا اور کیا ملنے والا تھا۔ ہائے وہ کیا دن تھے اور کیا راتیں اور اب ایک وقت کی سوکھی روٹی کو ترستے ہیں۔ رزق کا دینے والا اللہ ہے۔ وہ جب بھی دے گا، دے گا چھپڑ پھاڑ کے....

سماجی حالات اور انسانی رویوں کی یہ کہانی ہمیں سنائی قرۃ العین حیدر نے اپنے فکشن کی زبانی۔ پھر اس پر تفصیلی اور تشریحی روشنی ڈالی اپنے مختلف انٹرویوز میں۔ بہ سرعت بدلتے ہوئے حالات کا اندازہ اور فکر وخیال میں ہوئی تبدیلی کے واضح نقوش ۱۹۵۲عیسوی سے اب تک کے ان انٹرویوز میں بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ سیاسی زلزلے ذہنوں پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں، سماجی رویوں کے ساتھ ساتھ الفاظ اپنے معانی کس طرح بدلتے ہیں ان تمام باتوں کی تشریحی وضاحت قرۃ العین حیدر کے یہ انٹرویوز پیش کرتے ہیں۔ معاملہ ذہن کے دریچوں کو وا کر کے پڑھنے اور فہم وفراست کی بلندی سے سمجھنے کا ہے۔ اب مکالمہ قاری اور مصنفہ کا براہ راست ہے۔ وہ کہیں اور آپ سمجھیں۔

یہ تمام انٹرویوز گرچہ شایع شدہ ہیں اور مختلف اخبارات ورسائل سے جمع کیے گئے ہیں پھر بھی کتابی صورت میں شایع ہونے سے قبل قرۃ العین حیدر صاحبہ نے ان پر نظر ثانی کی تھی (یہ بات

2001 کی ہے جب 'نوائے سروش' شایع ہوئی تھی) اور بہت سی تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ موجودہ حالات میں جو چیزیں غیر ضروری معلوم ہوئیں انھیں حذف کر دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ اس طرح ان تمام انٹرویوز کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اگر حذف و اضافہ نہ بھی ہوتا تو بھی ان انٹرویوز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

دستاویزی نوعیت کی حامل یہ کتاب ادب کے قارئین، محققین، ناقدین اور اسکالرز کے لیے ایک ایسا بیش قیمتی اور نادر و نایاب تحفہ ہے جس کے لیے وہ میری جتنی بھی ستائش کریں کم ہے۔ شکریے کا لفظ کام کی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے بخالت و کنجوسی کی مثال ہوگا۔ ویسے میں صلہ و ستائش کی تمنا کیے بغیر ادب کے طالب علم، قاری اور محققین کی سہولت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جان جوکھم کا یہ کام میں نے کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر پر کسی بھی نوع کا کام کرنے والے لوگ اس کتاب سے صرف نظر کر کے کوئی اہم ادبی و تحقیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکیں گے۔

میں شفیع عقیل اور شہزاد منظر مرحوم کا خاص طور پر شکر گزار ہوں، جنھوں نے اپنے غیر مطبوعہ انٹرویوز مجھے دیے، جنھوں نے تحقیق کی کئی گتھیوں کو سلجھانے میں میری مدد کی۔ میں ہند و پاک کے ان تمام اشخاص اور ادارے کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، جنھوں نے انٹرویوز کی نشاندہی کی اور ان کی فراہمی میں میری معاونت کی۔

میں قرۃ العین حیدر صاحبہ کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری گزارش پر اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا کی (یہ واقعہ نومبر 2001 کا ہے جب وہ باحیات تھیں) جس سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو گیا۔

قرۃ العین کی ان بکھری ہوئی تحریروں کو مجتمع کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے میری معاونت کی ہے، جن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر نجیب اختر، برادر عزیز کفیل اختر، ڈاکٹر ارشد رضا بھاگلپور، عزیزی جاوید اختر، بزرگ محترم مہر الٰہی ندیم صاحب، برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر تحسین فراقی (لاہور)، ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی)، صبا اکرام (کراچی)، علی حیدر ملک (کراچی)، پروفیسر مرزا حامد

بیگ (لاہور)، پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)، پروفیسر علی احمد فاطمی، چودھری ابن النصیر (ایڈیٹر 'پہچان')، شمع افروز زیدی (ایڈیٹر 'بیسویں صدی')، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رام پور) کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ تحقیق کے مشکل مرحلے میں ان تمام لوگوں کا پرخلوص تعاون مجھے ملتا رہا ہے تبھی تنکا تنکا جمع ہوسکا، اور جو رہ گیا ہے وہ بھی انشاء اللہ حاصل ہو جائے گا۔

اداروں میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، انصاری لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرۃ العین حیدر آرکائیو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد کا بھی شکریہ لازم ہے جن کی پرخلوص معاونت نے تحقیق کے سر حلے کو آسان بنادیا فرداً فرداً سب کا نام گنوانا ممکن نہیں۔ لیکن ان کے کرم خاص کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

قومی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے تعاون کے بغیر کلیات کی طباعت کا خواب ادھورا رہتا۔ لہٰذا میں قومی کونسل کے تمام افراد کا جنھوں نے کلیات کی طباعت و اشاعت کے کسی بھی مرحلے میں مدد کی میں فرداً فرداً سبھی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آخری شکریہ نوجوان دوست تنویر احمد کا جن کی محنت شاقہ سے کلیات کمپوزنگ کے دشوار گزار مرحلے سے گزر کر مکمل ہوئی اور طباعت تک پہنچی۔

بیوی اور بچوں کا شکریہ کیا ادا کروں، ان کی حق تلفی کا مجھے شدید احساس ہے لیکن ملول خاطر نہیں ہوتے۔

جمیل اختر

موبائل:9818318512

ای میل:jameelakhtar786@yahoo.com

جنوری 2015

نئی دہلی

عادت پڑ گئی ہے نقادوں کو ادب میں حکمرانی کی

گفتگو : جمیل اختر

جمیل اختر:

آپ نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے پہلی کہانی سات سال کی عمر میں لکھی۔ ایک دوسرے بیان میں کہا ہے کہ پہلی کہانی چھ سال کی عمر میں لکھی، کہانی کا عنوان 'کاٹھ گودام کا اسٹیشن' ہے۔ پھر ایک انٹرویو میں کہا کہ پہلی کہانی 1938 میں شایع ہوئی اس وقت آپ کی عمر تقریباً گیارہ سال کی تھی۔ ان تینوں بیان میں کون سا بیان صحیح ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی کون سا ایسا مقدمہ ہے یہ؟ چھ سال میں لکھی یا سات سال میں کیا فرق پڑتا ہے۔ چھ سال نہیں رہی ہوگی سات سال رہی ہوگی، آپ تو بات پکڑ رہے ہیں۔ اب مجھے صحیح یاد نہیں کہ چھے سال تھی یا سات سال، ویسے چھپی جو ہے وہ 1938 میں۔ اس سے قبل میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ شایع نہیں ہوئی۔ پہلے میں نے بچوں کے اخبار 'پھول' میں لکھنا شروع کیا۔ پہلی کہانی جو میں نے لکھی تھی وہ یقیناً چھے سال کی عمر میں لکھی تھی۔ یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ

کہہ رہی ہوں۔ وہ کہانی ادھوری تھی، اس کا پہلا جملہ بھی مجھے یاد ہے۔ رات کے بارہ بجے تھے قلی کاٹھ گودام کے اسٹیشن پر لالٹین لیے گھوم رہے تھے۔

جمیل اختر :

آپ کی ایک کتاب ''میرے بہترین افسانے'' کا انتساب ہے۔ گم شدہ زمانوں کے نام جن کی تلاش میں نہ جانے اور کتنے زمانے لگ جائیں گے''۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

قرۃ العین حیدر :

یہ انتساب میرا نہیں ہے، یہ میں نے نہیں کیا ہے، یہ پبلی شر نے کیا ہے اور میری زیادہ تر کتابوں کا انتساب ان ہی لوگوں نے کیا ہے۔ یہ سارے انتساب ان ہی لوگوں کے ہیں، یہ بکواس کرتے ہیں یہ بوگس بات لکھتے ہیں۔ اس طرح کی بکواس اور بوگس بات میں نے کبھی کی ہی نہیں اور نہ کبھی لکھی۔ انتساب یہاں تک ہوا ہے کہ ایک صاحب نے یہ لکھا تھا کہ ''میرے اپنے نام'' اس طرح کی باتیں لکھنے میں انھیں کیا ملتا ہے، یہ مذاق کرتے ہیں، میں اس طرح کی باتیں کبھی پسند نہیں کرتی۔ بدتمیز ہیں بغیر پوچھے وہ اس طرح کی باتیں لکھتے ہیں تو میں کیا کروں؟ مجھے تو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بہت سے انتساب تو میں نے آج تک دیکھے بھی نہیں۔ اسے تو ہم انتہا درجہ کی بے ہودگی ہی کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ کے علم میں لائے بغیر جو جی چاہا لکھ دیا۔ یہ پچھلے زمانے کے نام تو فلانے کے نام۔ دیکھیے آپ میری تمام باتیں نوٹ کیجیے، جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ سب لکھیے۔

جمیل اختر:

سب کچھ ریکارڈ ہو رہا ہے، بعد میں آپ کو دکھلا دوں گا۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا ٹھیک ہے۔

جمیل اختر:

ہر ادیب زندگی میں کسی نہ کسی سوال کا جواب چاہتا ہے، چھوٹا ادیب زندگی کی ایک پرت اتار کر اطمینان کر لیتا ہے لیکن بڑا ادیب ہمیشہ پرت اتارتا رہتا ہے، آپ بھی ایک بڑی ادیبہ ہیں

اور آپ نے بھی زندگی کی پرتیں اتاری ہیں آخر وہ کون سی حقیقت ہے جس کی آپ کو تلاش ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ کیا آپ بوگس بات کر رہے ہیں۔ ایک تو یہ چھوٹا ادیب اور بڑا ادیب کی بات۔ یہ درجہ بندی بہت غلط ہے، چھوٹا ادیب کیا ہوتا ہے ادیب تو صرف ادیب ہوتا ہے۔ آپ کا جو سوال ہے یہ ہی مجھے بہت عجیب معلوم ہوتا ہے، اب رہا زندگی کی حقیقتوں کی تلاش۔ تو کیا کہا آپ نے؟

جمیل اختر:

آخر وہ کون سی حقیقت ہے جس کی آپ کو تلاش ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی یہ بڑی بوگس بات ہے۔ ہر ادیب کو کسی نہ کسی حقیقت کی تلاش ہوتی ہے، یہ ایک فلسفیانہ بات آپ کر رہے ہیں جس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ حقیقت کی تلاش۔ چلیے آگے چلیے۔ دیکھیے ابھی جو آپ سوال کر رہے ہیں نا یہ بوگس قسم کی فلسفیانہ بات ہے، بہت سے ادیب تو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں میں نہیں کرتی اس طرح کی باتیں۔

جمیل اختر:

جن سوالوں کے جواب آپ نہیں دینا چاہتی ہیں تو نہیں دیں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں میں تمام سوالوں کے جواب دے رہی ہوں۔ آپ کو یہ تمام باتیں لکھنی ہوں گی۔

جمیل اختر:

جی ہاں! میں آپ کی تمام باتیں ٹیپ کر رہا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا ٹھیک ہے۔ چلیے آگے چلیے۔

جمیل اختر:

بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ آپ کے یہاں راج ہٹ، بال ہٹ، تریا ہٹ تینوں ہٹ موجود

ہیں اور یہ کہ آپ کسی خواب کے تعاقب میں ہیں اس پر کچھ روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے یہ بانو قدسیہ کے خیالات ہیں۔ وہ جانیں۔ لوگ افسانوی ادب میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ میں اس طرح کی باتیں نہیں کرتی۔ میں خواب کے تعاقب میں نہیں ہوں۔ یہ فالتو بات ہے، بوگس بات ہے کیوں اس طرح کی باتیں لوگ کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے اس طرح کی باتیں کہی ہیں تو وہ جانیں۔ خواب کا تعاقب کلیشے ہے۔

جمیل اختر:

آپ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کافی اختلاف ہے۔ خود آپ نے بھی اس طرح اختلاف کو کافی الجھا دیا ہے۔ اب تک جو تاریخ پیدائش آپ سے منسوب کی جاتی ہے یعنی ۲۰ر جنوری 1927 عیسوی لیکن یہ تاریخ بھی بقول آپ کے صحیح نہیں ہے تو آخر صحیح کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

(زور دے کر) صاحب اس سے کیا مطلب ہے؟ تاریخ پیدائش کا جو مقدمہ چل رہا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ فرق کیا پڑتا ہے..... کیا فرق پڑتا ہے.......... 20 جنوری 26 ہے یا 27 ہے، یا 28 ہے یا 16 ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ Doesn't Matter ڈزنٹ میٹر۔ ویسے میں پیدا 1927 میں ہوئی ہوں۔

جمیل اختر:

''کار جہاں دراز ہے'' میں علی گڑھ کے باب میں آپ کی پیدائش کا کوئی ذکر نہیں ہے، یہاں تک کہ 1930 تک آپ کے والد نے پورٹ بلیئر سے جتنے بھی خطوط بھیجے اس میں بھی آپ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جبکہ بڑے بھائی مصطفیٰ حیدر عرف چھبو کا ذکر تقریباً تمام خطوں میں ہے۔ یہ بات خاصی حیرت انگیز ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی خیریت تو دریافت کر رہا ہے لیکن بیٹی کو بالکل فراموش کیے ہوا ہے یہ بات ناقابل فہم ہے۔ کیا آپ نے خط ایڈٹ کر کے چھاپا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ آپ میرے والد صاحب کو نہ لائیے بیچ میں۔ میرے والد کا تذکرہ اس طرح آپ مت کیجیے کہ انھوں نے یہ کیوں نہیں لکھا۔ یہ جو آپ کہہ رہے ہیں غلط ہے۔ نہ میں نے خط ایڈٹ کیا ہے.......... یہ آپ میرے والد کا نکالیے، والد کا آپ مت لکھیے۔ والد کو مت گھسیٹیے بیچ میں، بالکل یہ آپ بے کار کے سوالات کر رہے ہیں۔ ارے کہاں لکھا ہے کون سا خط ہے۔ میں نے تو خود تذکرہ کیا ہے پورٹ بلیئر کا۔ میری اوّلین یادیں پورٹ بلیئر کی ہیں۔

جمیل اختر:

وہ خط جو" کار جہاں دراز ہے" میں شامل ہے۔ اس کی بات میں کر رہا ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! اس میں کیا ہے؟ نہیں لکھا ہوگا۔ ایک بہت چھوٹی سی بچی ہے اس کے بارے میں نہیں لکھا ہوگا۔ بچہ بڑا تھا۔ پڑھ رہا تھا اس کے بارے میں لکھا ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ سارے خطوط نہیں چھپے ہیں کسی خط میں ذکر ہوگا۔

جمیل اختر:

کسی کسی خط میں ذکر نہ ہونے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن تمام خطوں میں سے کسی میں بھی آپ کا ذکر نہ ہونا، حیرت میں ڈالنے والی بات ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں کہہ چکی نا کہ نہیں کیا ہوگا ذکر۔ اس میں کون سی ایسی بات ہوگئی۔ آپ تو بالکل پیچھے ہی پڑ گئے۔ چلیے کوئی اور سوال کیجیے۔

جمیل اختر:

آپ نے اپنے فکشن میں وقت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ نہ تو اسلامی وقت سے میل کھاتا ہے نہ ہی ایلیٹ اور اقبال کے تصور وقت سے مکمل مماثلت ہے پھر آپ نے کون سے تصور وقت کو اپنا معیار بنایا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے صاحب! اسلامی وقت کون سا ہے؟ ایلیٹ کا وقت کون سا ہے، اقبال کا وقت کون سا ہے۔ سقراط کا وقت کون سا ہے، بقراط کا وقت کون سا ہے۔ اس سے مجھے کوئی تعلق نہیں جس طرح میرا دل چاہا میں نے لکھا۔ یہ سب فلسفیانہ موشگافیاں ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

جمیل اختر:

ان تصورات پر کچھ روشنی ڈالیں گی آپ؟

قرۃ العین حیدر:

کیا روشنی ڈالوں میں جو میری سمجھ میں آیا میں نے لکھا۔ وقت کا جو تصور تھا میرے ذہن میں وہ میں نے لکھا۔ اب میں اس کو کیا بتاؤں......؟ کیا؟ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟ اسلامی وقت کا تصور کیا ہے؟ سائیکلک وقت کا تصور کیا ہے؟ یہ تو بڑی لمبی بحث کا موضوع ہے۔ سائیکلک وقت کیا ہے؟ اسلامی وقت کیا ہے؟ ہبرو وقت کیا ہے؟ سمٹک SEMITIC پوائنٹ آف ویو کیا ہے؟ چائنیز پوائنٹ آف ویو کیا ہے۔ اس پر بحث کیجیے گا آپ بیٹھ کر مجھ سے۔ یہ بحثیں لمبی ہوتی ہیں۔ مہینوں برسوں چلتی ہیں، چند منٹ کے انٹرویو میں کیا جواب دے سکتی ہوں؟

جمیل اختر:

آپا! بحث کا سوال نہیں ہے میں تو آپ سے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان تصورات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، اگر آپ بتانا نہیں چاہتی ہیں تو کوئی بات نہیں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں۔ یہ تو ایک لمبی بحث کا موضوع ہے پھر کبھی دیکھیں گے۔

جمیل اختر:

آپ کے تصور وقت میں ایک طرف کلیت کے عناصر ہیں تو دوسری طرف جبر کا تصور ہے تو تیسری طرف وقت منجمد شے ہے۔ وقت کا ایک اور تصور جو آپ کے ان تمام تصورات پر حاوی نظر آتا ہے وہ رواں دواں اور جاری وساری وقت کا ہے یعنی وقت تغیر پذیر شے ہے۔ یعنی

خدا (جو خود وقت ہے) زمانے اور دن رات کی قسمیں کھاتا ہے جو متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ ان تصورات پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی منجمد وقت کا ہے، رواں دواں وقت کا ہے۔ ہائے ہائے منجمد وقت کہاں ہے، رواں دواں وقت کہاں ہے، بھئی لکھ رہے ہیں جیسا لکھنا ہے، لکھنے میں جو آتا ہے لکھتے جاتے ہیں۔ اس کو جو آپ لوگ بیٹھ کر بقراط کی طرح سے ANALYSE کرتے ہیں، وہ چیز مجھے بہت غلط لگتی ہے۔ THAT IS VERY FUNNY منجمد وقت، رواں دواں وقت۔ ارے بھئی وقت تو ہے رواں دواں اور منجمد بھی ہے اور اس کو بیٹھ کے اس طرح...... دیکھیے لکھنے کی پروسیس بالکل مختلف ہوتی ہے اگر آپ خود لکھتے ہیں تو آپ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس پر کوئی اطمینان بخش گفتگو نہیں کی جاسکتی ہے۔

جمیل اختر:

''آگ کا دریا'' کے سرنامۂ آغاز میں آپ نے وقت کے حوالے سے ایلیٹ کی جو نظم نقل کی ہے اس نے بھی آپ کے تصور وقت کے بارے میں کافی غلط فہمی پیدا کی ہے اور لوگوں نے آپ کے تصور وقت کو ایلیٹ کے تصور وقت سے مماثل قرار دے دیا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ آپ نے اپنے فکشن میں انسانی کرب کی جو داستان بیان کی ہے یہ نظم اس لامتناہی سلسلے کو تسلسل فراہم کرتی ہے اور کرب جو ازلی و ابدی ہے اور جو انسان کا مقدر ہے ہر عہد میں اپنی پوری جلوہ سامانی کے ساتھ موجود رہتا ہے اور یہی کرب کے لمحات کے آپ کے فکشن کے ستون ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے میں اس کی بقراطی فلسفیانہ گفتگو نہیں کرتی۔ اب میں کیا وقت پر بیٹھ کر پورا لکچر دوں۔ آپ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک کریئیٹو رائٹر جو لکھنے بیٹھتا ہے اس کا ایک پورا کریئیٹو پروسس ہوتا ہے اس کے لحاظ سے وہ لکھتا چلا جاتا ہے۔ اس کو آپ لوگ بیٹھ کر بعد میں ANALYSE کریں یا

آپ اس پر بحث کریں کہ آپ نے اس کو اس طرح سے کیوں لکھا؟ جو شخص کریٹو رائٹر نہیں ہے وہ اس بات کو اس طرح سے سمجھ نہیں سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقاد کریٹو رائٹر کے معاملے میں بہت گڑبڑ کرتے ہیں۔ چلیے آگے چلیے۔

جمیل اختر:

وقت کی تین قسمیں ہیں، ماضی، حال اور مستقبل اور ان سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تین طرح کے ہیں۔ جو لوگ ماضی کے شیدائی ہیں ان کے سامنے کسی دوسرے زمانے کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ صرف یاد ماضی میں کھوئے رہتے ہیں۔ خواہ یہ ان کا اپنا ذاتی ماضی ہو خواہ خاندان اور آباواجداد کی شکل میں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حسب نسب اور ماضی کی یادوں کے سلسلے میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ آپ بھی وقت کی پہلی قسم ماضی کی اسیر ہیں کہیں اس سے باہر نکلتی ہوئی نظر نہیں آتیں، نہ ہی ماضی آپ کے لیے سامان عبرت و نصیحت ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ آپ کھوئے ہوؤں کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ آخر اس کے پیچھے کون سی نفسیات کام کر رہی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے کیا پتہ؟.......... مجھے کیا معلوم؟.......... اگر مجھے معلوم ہو تو میں کسی سائیکٹرک کے پاس جاؤں، تجزیہ کراؤں، پھر بتلاؤں کہ کون سی نفسیات کام کر رہی ہے؟ ارے بھئی! ایک انسان لکھ رہا ہے اس کو دلچسپی ہے ہسٹری سے۔ اس کو ماضی سے دلچسپی ہے وہ لکھ رہا ہے۔ تو اس میں نفسیات کیا ہے؟ کوئی شخص ہے اس کو دلچسپی کرکٹ سے وہ کرکٹ کے بارے میں لکھتا ہے، کوئی شخص ہے اس کو دلچسپی میوزک سے ہے وہ میوزک کے بار ے میں لکھتا ہے، مجھے دلچسپی ہسٹری سے ہے میں لکھ رہی ہوں۔ اس میں نفسیات کیا ہے؟ یہ جو آپ لوگ اس طرح کی بہت ہی بقراطی...... بہت ہی بقراطی کی بات کرتے ہیں، نفسیات کیا ہے؟ کیا نفسیات ہوتی ہے لکھنے والے کی جو لکھنے بیٹھتا ہے، اس کی نفسیات کیا ہوتی ہے؟

جمیل اختر:

شوکت صدیقی کا خیال ہے کہ آپ کے یہاں وقت کا جو تصور ہے وہ

CONVENTIONAL ہے، یعنی جہاں، جہانِ گزراں ہے، وقت کا ماضی اور حال اور مستقبل کا جو تصور ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔

''وقت صرف ایک ہے ماضی ہے نہ فردا ہے نہ حال''

کیا آپ اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میں اس طرح کی بے وقوفی کی گفتگو اور بحث میں حصہ نہیں لیتی یہ کیا بات ہوئی وقت ماضی ہے نہ حال ہے نہ مستقبل ہے، شوکت صدیقی اگر یہ بات کہتے ہیں تو کہنے دیجئے، وقت کے بارے میں میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ لکھا ہے جس کو پڑھنا ہے وہ پڑھے جس کو سمجھنا ہے وہ سمجھے نہ سمجھے اس کے بارے میں باتیں کرنا تضیع اوقات ہے۔

جمیل اختر:

وقت، تہذیب، تاریخ اور ماضی، ان سبھوں کی دھارائیں آپ کے یہاں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ مختلف رو ایک ہی سمت میں گامزن ہیں اور سب کا مقصد ایک ہی ہے کیا آپ نے سبھوں کو یکجا کر کے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یا اس کی کچھ فلسفیانہ وجوہات ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

وقت اور تاریخ ایک ہی چیز تو ہے اور کیا ہے؟ ارے بھئی! کوئی فلسفیانہ وجوہات نہیں ہیں بس لکھ رہے ہیں۔ خدا کے لیے..........پلیز انڈر اسٹینڈ۔ جب کوئی آدمی..........کریٹو رائٹر لکھنے کے لیے بیٹھتا ہے تو اس کے بہت سے محرکات ہوتے ہیں۔ اس کے بہت سے خیالات ہوتے ہیں اس کے پیچھے بہت سی بیک گراؤنڈ ہوتی ہے۔ وہ ان کو ملا کے لکھتا ہے اس کو بیٹھ کے اس طرح ANALYSE کرنا جو آپ کر رہے ہیں اس کا جواب بہت مشکل ہے، کیسے اس کو میں بیان کروں..........کیا کہہ رہے ہیں آپ.....کیا فلسفیانہ..........کہہ کیا رہے ہیں آپ پھر سے کہیے۔

جمیل اختر:

یہی کہ ساری روایک ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وقت بھی ہے، ماضی بھی ہے، تہذیب بھی ہے، تاریخ بھی ہے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے آپ نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ارے ظاہر بات ہے، زور پیدا کرنے کی چیز.........آپ تو خود ہی بیان کر رہے ہیں یکجا کرتی ہوں، تاریخ کی دھارا اور فلانا۔ زور پیدا کرنے کی کیا بات آئی جس طریقے سے میں نے دیکھا چیزوں کو ویسے لکھ دیا اب میں نے اس میں زور پیدا کیا یا کم زوری پیدا کی یہ تو میں نہیں جانتی۔

جمیل اختر:

آپ کے فکشن کی تمام تر اپروچ ہسٹری کی ہے۔ لیکن اس طرح سے یہ تاریخی ناول بھی نہیں جس طرح کے اور تاریخی ناول ہیں، بلکہ آپ کے ناول کی بنیاد تاریخ اور سماجیات پر ہے اور پھر آپ نے دونوں کو ملا کر اپنے پلاٹ کے تانے بانے کو بُنا ہے یہ تجربہ اردو میں نیا ہے، اس تجربے کے پیچھے کوئی خاص مقصد کارفرما رہا ہے یا آپ نے کچھ نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اسے آپ META-HISTORY یا مابعد التواریخ کہہ سکتے ہیں۔ دیکھیے یہ آپ نے اپنی بات کا خود ہی جواب دے دیا ہے۔ اب اس پر میں کیا بات کروں آپ سے۔ ایک چیز جس سے مجھ کو دلچسپی تھی میں نے لکھا اس کے بارے میں اب اگر اس کے کوئی معنی بنتے ہیں۔ اس سے کوئی بات نکلتی ہے تو اچھی بات ہے۔ میں نے ایک طریقے سے چیزوں کو دیکھا۔ اس کے بارے میں ایک طریقے سے لکھا بس قصہ ختم۔ اس کا تجزیہ کیسے کروں؟

جمیل اختر:

آپ نے تہذیبی تسلسل کی تلاش میں ہزاروں برس کے تہذیبی سرمایے کو کھنگالا ہے۔

جسے آپ تہذیبی کنٹی نیوٹی کہتی ہیں۔ اس پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

(خفا ہوتے ہوئے) کیا ڈالوں گی بھئی۔ اس پر تو بہت لکھا گیا ہے خدا کے لیے...... اتنا لکھا گیا ہے اتنا لکھا گیا ہے...... بور نہیں ہوئے آپ اس کے بارے میں۔ میری تحریر میں جو اور دوسری چیزیں ہیں اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ کہا جاتا ہے کہ خواتین کے یہاں SENSE OF HUMOUR نہیں ہے۔ ان کے یہاں سنجیدگی بہت ہے لیکن میرے یہاں ایسا نہیں ہے۔ میرے یہاں طنز و مزاح وافر ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ آج تک کسی ایک نقاد نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ اس کے بارے میں لکھنا تو درکنار ہے جسے نقادوں کی کم نظری کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے چند ایک کے ہاتھ میں تاریخیت کا نسخہ آ گیا ہے اسی کو دہرائے جاتے ہیں۔ یعنی میرے بارے میں بڑی ہی تعجب کی بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی نے میرے طنز و مزاح کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔

جمیل اختر:

ذرا میرے انٹرویو کے لیے آپ دو چار جملے ہی سہی۔ تہذیبی تسلسل کے بارے میں بتلائیں۔

قرۃ العین حیدر:

کیا بتلاؤں؟ تہذیبی تسلسل کے بارے میں۔ اتنا لکھا گیا ہے کہ اب میں کیا لکھوں اور کیا بتاؤں آپ کو اس کے بارے میں۔ سارے سوالوں کے جوابات خود آپ کے پاس موجود ہیں............ اوہو............ تہذیبی تسلسل۔ ارے بھئی کیا لکھو؟ کیا بتاؤں، سب ہو گیا، بھیا اب معاف کرو، بابا ہو گیا۔

جمیل اختر:

''انڈو برٹش کلچر'' جس کا ذکر آپ نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے یہ تو ہندستان میں ایک محدود طبقے کا کلچر تھا۔ لیکن آپ کی تخلیقات میں یہ کلچر اس طرح چھایا ہوا ہے جیسے یہ ہندستان کا ڈومننٹ کلچر رہا ہو۔

قرۃ العین حیدر:

اُف! کیا کروں اس کے لیے میں۔ آپ یہ جو بات اس طرح کر رہے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ برٹش کلچر ایک محدود طبقے کا کلچر نہیں تھا۔ ایک کولونیل سوسائٹی تھی، گاؤں تک میں وہ کلچر پہنچ چکا تھا۔ گاؤں تک کا جو بچہ تھا وہ اسکول جاتا تھا، گاؤں تک کا جو بچہ تھا وہ ریڈیو سنتا تھا۔ تو آپ کا جو یہ CONCEPT ہے انڈو برٹش کلچر کا وہ بڑا محدود اور بڑا غلط ہے۔ پورا ہندستان جو تھا وہ اس کلچر میں شامل تھا۔ پورا ہندستان ایک کلونیل سوسائٹی تھا اور میں بھی اسی سوسائٹی میں شامل تھی۔

جمیل اختر:

''آگ کا دریا'' میں تاریخ کے جس فلسفے کو آپ نے ہندو دیو مالا کے توسط سے پیش کیا ہے میرے خیال میں آپ خود اس فلسفے سے متفق نہیں ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس فلسفے کا سہارا لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس فلسفے کے سہارے انسان کے ازلی وابدی کرب کو ایک خاص تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! میں نے 25 ہزار مرتبہ یہ کہا ہے کہ میں نے تاریخ کا فلسفہ پیش نہیں کیا۔ 25 ہزار مرتبہ یہ بات میں نے اپنے انٹرویو میں کہی ہے کہ یہ تاریخ کا CONTINUUM ہے (تسلسل) وقت کا CONTINUUM ہے...... اس کا کوئی CONCEPT نہیں ہے تاریخ سے بھئی۔ جو نام رکھے ہیں میں نے محض ناموں کا تسلسل ہیں۔ میں تو کتاب لکھ کے بھئی بہت پچھتائی ہوں۔ اللہ (زور سے) بہت پچھتائی۔

جمیل اختر:

''آگ کا دریا'' دسمبر 1959 میں شایع ہوا، اس کے تین ماہ بعد 20 اپریل 60 کے جنگ اور مورننگ نیوز میں سراج رضوی کا ایک مضمون شایع ہوا جس سے ہندستان اور پاکستان دونوں میں اس ناول کی حیرت انگیز تاویلیں پیش کی گئیں۔ پاکستان میں اسے پاکستان مخالف اور ہندستان میں اسے ہند مخالف قرار دیا گیا ہے اور کرشن چندر کی سفارش کے باوجود مکتبہ جامعہ نے

اسے ہند مخالف سمجھ کر شائع کرنے سے منع کر دیا۔ کیا یہ سچ ہے؟ اس پورے واقعہ پر آپ تفصیل سے روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی! میں اس واقعہ سے عاجز آ چکی ہوں۔ اس واقعہ کا تذکرہ سنتے سنتے تھک گئی ہوں۔ یہ بالکل ایک چائے کی پیالی میں طوفان ہے۔ اتنا اس چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے، اس لیے کہ اردو والوں کے پاس کوئی کام کوئی بات، کوئی دلچسپی نہیں اور نہیں تھی۔ کیا اتنا ہنگامہ اس بات کے لیے کیوں اٹھایا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ بات کا بتنگڑ رائی کا پربت ہے۔

جمیل اختر:

کیا مکتبہ جامعہ نے اس وقت چھاپنے سے منع کر دیا تھا؟

قرۃ العین حیدر:

کیا ہوگا۔ مجھے اس وقت بالکل یاد نہیں۔ یہ اتنا اہم نہیں ہے اور نہ یہ پورا واقعہ اتنا اہم ہے۔ میں نے کہا نا کہ یہ چائے کی پیالی میں طوفان تھا۔ غالباً کرشن چندر نے ان سے کہا تھا اور غلام ربانی تاباں نے اسے چھاپنے سے منع کر دیا تھا۔ شاید وہ اس وقت کی کنٹرووری سے ڈر گئے تھے۔

جمیل اختر:

1959 میں 'آگ کا دریا' شائع ہوا اور اس سے کچھ قبل پاکستان میں مارشل لا نافذ ہو گیا اور پری سنسر شپ نافذ کر دی گئی اور ہر پرنٹر اور پبلشر کو ہدایت جاری کی گئی کہ سنسر کرائے بغیر کوئی بھی چیز شائع نہیں کی جائے۔ تو کیا ''آگ کا دریا'' بھی سنسر کے پروسس سے گذرا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

شاید............ یاد نہیں آ رہا............ ''آگ کا دریا'' سنسر کے پروسس سے نہیں گذرا تھا............ لیکن یہ بات اتنی پرانی ہو گئی ہے۔ کہاں تک ان باتوں کو دہراتے پھریں گے۔ کہاں تک....

جمیل اختر:

لیکن تحقیق میں چیزیں آتی ہیں اور سچائی جاننے کے لیے بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا ٹھیک ہے۔ چلیے آگے چلیے۔

جمیل اختر:

مجھے معلوم ہوا کہ آپ کے حلقۂ احباب میں قدرت اللہ شہاب بھی تھے جو جنرل ایوب خان کے پرسنل سکریٹری تھے۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد ابن سعید اور جمیل الدین عالی کے کہنے پر آپ نے ''آگ کا دریا'' کا کتابت شدہ مسودہ اسی نقطہ نظر سے ان کو پڑھنے کے لیے دیا تھا اور شہاب صاحب نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ میرے پڑھنے کے بعد حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ انھوں نے پڑھنے کے بعد اس کتاب میں جتنی جگہیں نشان زد کی تھیں آپ نے وہ تمام جملے اور الفاظ کتاب سے نکال دیے اور اس کی جگہ ڈیش ڈیش ڈال دیے اس کے بعد کتاب شایع ہوئی۔ اس واقعہ پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

غلط۔ بالکل غلط، ٹوٹلی غلط۔ شاید شہاب صاحب کو پڑھنے کو دیا تھا یہ الگ بات ہے، لیکن انھوں نے نہ کسی جگہ نشان ڈالے تھے اور نہ میں نے نکالے تھے۔

جمیل اختر:

آپ نے نہیں نکالے تھے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں.......... جو نکالے ہیں میں نے بعد میں خود نکالے ہیں، کسی کے کہنے سے میں نے نہیں نکالے ہیں۔

جمیل اختر:

اچھا۔ اسی سے جڑا ہوا ایک سوال اور ہے۔

قرۃ العین حیدر:

کہیے!

جمیل اختر:

کتاب کی اشاعت کے بعد شہاب صاحب کی یقین دہانی کے باوجود حکومت کی طرف سے اس پر سنسر لگانے کی باضابطہ کارروائی ہوئی جس کی تصدیق اے ایس ایم احمد نے جو بیورو وقار نیشنل ری کنسٹرکشن کے ڈائرکٹر تھے ابن سعید سے اپنی ایک ملاقات میں کی۔ ابن سعید نے مجھ سے جب میں 1991 میں پاکستان گیا ہوا تھا اپنے ایک انٹرویو میں مجھ سے کہی، پاکستان میں عوامی سطح پر اس کتاب کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ اس کتاب کا پڑھنا حکومت کی نظر میں مناسب بات نہیں ہے۔ شہاب صاحب نے اس ہنگامے کو رفع دفع کرنے میں آپ کی بے حد مدد کی۔ حقیقت کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ بالکل غلط ہے۔ یہ چائے کی پیالی میں طوفان ہے۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا خاص۔ ایک آدمی تھا، سراج رضوی اس کا نام تھا۔ اس نے بریگیڈیئر گلزار ایک صاحب تھے جو وہاں پر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے۔ اس آدمی کو چاہیے تھا اپنے نام زمین الاٹ کروانا تو اس نے اس وقت جب مارشل لا نافذ ہو گیا تھا تو بریگیڈیئر گلزار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جنگ میں دو یا تین قسطوں میں وہ مضمون لکھا۔ اس مضمون میں اس قسم کی غلط بیانیاں تھیں کہ میں ڈاکٹر رشید جہاں کمیونسٹ کی سگی بھانجی ہوں۔ اس قسم کی بے سروپا باتوں نے اس مضمون کو بہت مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔

جمیل اختر:

دو قسطوں میں لکھا تھا۔ وہ مضمون میرے پاس ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا۔ وہ مضمون اس نے لکھا اور لے جا کر ان کو دکھلایا کہ دیکھیے صاحب یہ مضمون میں

نے لکھا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے، اس میں پاکستان کے خلاف بڑی اہم چیز ہے۔ اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوا اور چند روز میں قصہ ختم ہو گیا۔

جمیل اختر:

نہیں...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک صاحب تھے اے ایم ایس احمد جو بیورو فار ری کنسٹرکشن کے ڈائرکٹر تھے۔ ان کے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر تھے ان کا نام تھا اے .او. رضی الرحمٰن، انھوں نے بڑا سخت نوٹ اس کتاب کے خلاف لکھا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ یہ تو سراسر ہندستان کا پروپگنڈا ہے اور اس کی پوری تھیم جو ہے وہ یہ ہے کہ ہم جو ہیں یعنی پاکستانی تہذیب و تمدن یہ سب کچھ مدر انڈیا کے کمپونٹس ہیں۔ اس نوٹ کے بعد ''آگ کا دریا'' پر سنسر شپ لگانے کی باضابطہ کارروائی ہوئی اور احمد صاحب جو ڈائرکٹر تھے انھوں نے باضابطہ سنسر شپ کے کاغذات پر دستخط کیے۔ یہ بات مجھ سے 1991 میں جب میں پاکستان گیا ہوا تھا تو ابن سعید صاحب نے ایک ملاقات میں کہی تھی۔

قرۃ العین حیدر:

رضی الرحمٰن کون صاحب تھے؟ میں نہیں جانتی۔ ابن سعید اگر کہہ رہے ہیں تو ہوں گے مگر میں نہیں جانتی ان کو...... ہوں گے...... رہے ہوں گے...... اصل بات تو یہ ہے کہ اس کتاب پر پابندی نہیں لگی اور پاکستان میں اس کے بے شمار ایڈیشن نکلے اور اب تک نکل رہے ہیں۔

جمیل اختر:

اچھا۔ ابھی آپ نے کہا کہ آپ نے خود سے کچھ جملے اور الفاظ حذف کیے تھے، تو کیا ہندستانی اشاعت میں وہ حذف شدہ جملے آ گئے ہیں یا ہنوز وہ یوں ہی شائع ہو رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یاد نہیں...... مجھے بالکل یاد نہیں...... بھئی میں اس سے اتنی عاجز آ چکی ہوں، I am Fedup۔ بالکل یاد نہیں...... جملے وہ حذف ہوئے تھے اس کا تعلق کسی بھی سیاست سے نہیں تھا...... پتہ نہیں...... بالکل یاد نہیں...... آگے چلیے۔

جمیل اختر:

اب تو آپ ہندستان میں ہیں، کیا پرانے مسودے کی مدد سے ''آگ کا دریا'' کے حذف شدہ جملے اور الفاظ اپنی پہلی حالت میں لوٹائے نہیں جاسکتے تاکہ عوام کا تجسس دور ہو جاتا جواب تک برقرار ہے!

قرۃ العین حیدر:

کہانہ بھئی کہ مجھے بالکل یاد نہیں ہے اور نہ اب اس معاملے سے میری کوئی دلچسپی ہے۔ بات اتنی پرانی ہوگئی کہ اس پر منوں مٹی پڑ گئی۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ تو گڑے مردے اکھاڑنے بیٹھ گئے۔ ان باتوں کا آخر حاصل کیا ہے؟ چلیے کوئی اور بات کیجیے۔

جمیل اختر:

کیا یہ حقیقت ہے کہ آگ کا دریا پر تنازعہ کو ہوا دینے میں خود گلڈ کے لوگوں کا ہاتھ تھا۔ یہ بات مجھے پاکستان کے دورہ کے دوران گلڈ ہی کے ایک پرانے ممبر نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتلائی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ چوں کہ آپ کا ناول آدم جی انعام کے لیے اوّل قرار دیا گیا تھا اور کچھ لوگ شوکت صدیقی کے ناول 'خدا کی بستی' کو یہ انعام دلوانا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس کنٹروورسی کو ہوا دے کر لوگوں نے آپ کے ناول کو ریس سے باہر کر دیا اور پھر یہ انعام ان لوگوں کی خواہش کے مطابق ''خدا کی بستی'' کو ملا۔ اس قضیے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ بالکل غلط ہے۔ انعام...... میں نے جس وقت یہ آدم جی ایوارڈ کمیٹی بنی اور یہ طے ہوا تھا کہ 'آگ کا دریا' کو انعام دیا جائے گا تو اس وقت میں نے جمیل الدین عالی سے کہا کہ مجھ کو آپ اس کمیٹی میں رکھ دیجیے تاکہ یہ انعام مجھے نہ ملے۔ اصلیت یہ ہے اس کو آپ باقاعدہ موٹے حروف میں لکھیں۔

جمیل اختر:

بے شک میں ان جملوں کو نمایاں کر کے لکھوں گا۔

قرۃ العین حیدر:

لہٰذا انھوں نے ایسا ہی کیا اور میں کمیٹی میں شامل ہوئی اور میری کمیٹی میں میرے کنسرن سے یہ انعام شوکت صدیقی کے ناول 'خدا کی بستی' کو ملا۔ میں ججوں میں شامل تھی۔ ججوں میں میں بھی تھی مولوی عبدالحق بھی تھے اور کئی لوگ شامل تھے۔

جمیل اختر:

مولوی عبدالحق ہی کے حوالے سے مجھے یہ بات پاکستان میں بتلائی گئی کہ جب آگ کا دریا شائع ہوا تو مولوی صاحب نے کسی مجلس میں یہ کہا کہ یہ انعام عینی کے ناول ''آگ کا دریا'' کو دے دو۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! کہا ہوگا...... کہا ہوگا؟ بھئی ان سب باتوں سے میں عاجز آ گئی ہوں۔

جمیل اختر:

یہ سب تذکرے ابھی بھی محفلوں میں زندہ ہیں، جہاں کہیں جائیے گفتگو کیجیے یہ سارے سوالات سامنے آ جاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں آپ سے حقیقت جانوں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ واقعہ ہے کہ میں نے منع کیا کہ مجھ کو آپ کمیٹی میں رکھ دیجیے تا کہ یہ انعام مجھ کو نہ ملے۔ لہٰذا انھوں نے ایسا ہی کیا اور خدا کی بستی کو انعام دیا گیا۔

جمیل اختر:

ٹھیک ہے! یہ حقیقت اب سامنے آ گئی۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! واقعہ یہی ہے اور سچائی بھی یہی ہے جو میں نے بیان کی۔

جمیل اختر:

معذرت کے ساتھ یہ سوال آپ سے کر رہا ہوں۔ چونکہ بار بار یہ بات آپ کے حوالے

سے آتی ہے اور آپ کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ آپ حقائق کے بیان میں تصرف سے کام لیتی ہیں۔ جس سے سچائی کا پتہ لگانے میں اکثر الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

یہ بے وقوفی کی باتیں ہیں۔ ہر رائٹر کو یہ حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے بیان کرے۔ یہ کیا بات ہوئی، کیا مطلب ہے اس کا؟ سچائی کا بیان کیا ہے؟ سچائی کس کی، کیا سچائی، کوئی میں جرنلسٹ ہوں جو حقائق پیش کر رہی ہوں اور اس کو غلط پیش کیا یا پرویز مشرف نے کوئی بیان دیا اور میں نے اس کو توڑ موڑ کے پیش کیا تو آپ کہئے کہ آپ نے حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کیا ہے، یا سچائی کے بیان میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ لیکن جب ایک کریٹو رائٹر ہے جو فکشن لکھ رہا ہے تو وہ سچائی کو پیش کرے یا نہ کرے کیا فرق پڑتا ہے، سچائی کو پیش کرنا یا نہ کرنا ایک فکشن رائٹر کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے کہ فکشن رائٹر کی ایک الگ ہی سائیکی ہوتی ہے۔ یہ کون ہے جو اس طرح کی بے وقوفی کی بات کرتا ہے۔

جمیل اختر:

اکثر محفلوں میں یہ ذکر رہا ہے۔ پاکستان میں بھی لوگوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

سچائی...... کیا سچائی...... مطلب یہ کہ کریٹو رائٹر جو ناول لکھ رہے ہیں اس میں سچائی کیا ہوتی ہے، سچائی کس طرح پیش کرتے ہیں، وہ سچائی ہوتی ہے، ایک فکشن رائٹر کیا سچائی بیان کرتا ہے، کیا وہ سچائی ہوتی ہے۔

جمیل اختر:

نہیں وہ تو ظاہری بات ہے فکشن ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جب فکشن ہے تو فکشن ہے، کیا مطلب ہوا؟ میرے لیے یہ جھوٹ ہے کہ سچائی کو پیش

نہیں کرتی۔ آخر مطلب کیا ہوا آپ مجھ کو اس کا مطلب بتلائیے۔

جمیل اختر:

میرے خیال میں فکشن سے الگ ہٹ کر کے کچھ باتیں ہوں گی، کچھ حقائق ہوں گے جس پر کبھی کسی نے گفتگو کی ہوگی۔ یا ہسٹری کے تعلق سے کچھ بات ہوگی۔

قرۃ العین حیدر:

کیا؟...... کیا؟...... کیا بات ہوگی۔ بتلائیں نہ مجھے وہ۔

جمیل اختر:

ٹھیک ہے مجھے اس تعلق سے آپ کا جواب مل گیا۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے نا۔ جب اس طرح کا مجھ پر آپ الزام لگا رہے ہیں تو بتلائیے نا...... آپ مجھ کو، ثبوت پیش کیجئے، پوائنٹ آؤٹ کیجیے کہ آپ نے فلاں چیز غلط لکھی۔ یہ جو ویگ بات ہمارے یہاں کی جاتی ہے وہ بے حد غلط ہے۔ آپ مجھے بتلائیے۔ پوائنٹ پیش کیجیے کہ آپ نے فلاں جگہ فلاں بات غلط لکھی ہے یا غلط کہی ہے۔ فلاں انٹرویو میں آپ نے فلاں بات غلط کہی ہے، فلاں جگہ آپ نے سچائی کو چھپایا ہے، بتلائیے...... بتلائیے پوائنٹ آؤٹ کیجئے، اصلیت بتلائیے۔

جمیل اختر:

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے پوچھا ''آگ کا دریا'' کے سنسر شپ کے بارے میں، پاکستان چھوڑنے کے سبب کے بارے میں لوگ اب تک اٹکلیں لگا رہے ہیں اور آپ کے حوالے سے بھی کسی سچائی پر نہیں پہنچ پائے ہیں کہ اسباب کیا تھے؟

قرۃ العین حیدر:

اُف اُف۔ یہ پاکستان چھوڑنے کا مطلب خالص ذاتی مسئلہ ہے۔ میں یہ بات نہیں کرنا چاہتی۔

جمیل اختر:

ٹھیک ہے۔

قرۃ العین حیدر:

دنیا کے لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں، یہ لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ کیا بات ہے؟ برابر لوگ باہر جا رہے ہیں۔ یہاں سے پاکستان جا رہے ہیں، پاکستان سے انگلینڈ جا رہے ہیں۔ میرے لیے خاص بات ہوگئی جو لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔

جمیل اختر:

آپ کے پاکستان چھوڑنے کے بارے میں لوگ اب تک اٹکلیں لگا رہے ہیں۔ کچھ لوگ اس کا سبب ''آگ کا دریا'' کی کنٹرووری کو بتلاتے ہیں، کچھ لوگ پاکستان کی فضا آپ کے موافق نہ ہونے کو بتلاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہندستانی کمپنیوں میں آپ کے والد کے شیئر تھے اور جائنا میں بھی اور پورا کنبہ چونکہ پاکستان چلا گیا تھا اس لیے آپ واپس ہوئیں کہ اپنی ملکیت کو سنبھال سکیں۔ آخر سچائی کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ میرا بالکل ذاتی معاملہ ہے۔

جمیل اختر:

ہاں ہے تو ذاتی معاملہ۔

قرۃ العین حیدر:

جائنا میں شیئر تھے؟ (تعجب کے ساتھ)

جمیل اختر:

ہاں! پاکستان میں مجھے کچھ لوگوں نے بتایا کہ ہندستانی کمپنیوں اور جائنا میں شیئر تھے۔

قرۃ العین حیدر:

چلیے تھے۔ میں آگئی واپس، اپنی ملکیت سنبھال لی آکر۔

جمیل اختر:

آپ کے زیادہ تر ناولوں اور افسانوں میں مرکزی کردار عورت کا ہے اس کی کوئی خاص وجہ؟

قرۃ العین حیدر:

یہ کیا بات ہوئی؟ بھئی جب میں خود ایک خاتون ہوں تو اس کے بارے میں زیادہ جانکاری سے لکھوں گی۔ یہ تو اتنی ظاہری بات ہے کہ اس کے بارے میں اور کیا بتلاؤں؟ یہ ایک واقعہ ہے کہ خواتین مغرب اور مشرق دونوں جگہ جو فکشن بالخصوص ناول لکھتی ہیں جین آسٹن کے زمانے سے اب تک ان کا اپروچ وہ نہیں ہوتا جو ایک مرد رائٹر کا ہوگا۔ انسانی رشتوں یعنی HUMEN RELATIONSHIP روزمرہ کی زندگی کے مشاہدات ان کی باریک بینی خدمات کی کارفرمائی یہ سب چیزیں خواتین کے لیے ایک علاحدہ کائنات تخلیق کرتی ہیں۔ مغرب میں بھی ایک خاتون رائٹر کی ترجیحات، خیالات، نفسیات، ظاہر بات ہے کہ میسکولین نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ایک خاتون کی اصل کائنات اس کا کچن ہے، اس کا بیک یارڈ ہے، جہاں وہ کپڑے دھو کر الگنی پر ٹانگتی ہے اور پڑوسن سے بات کرتی ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر مغربی عورت کے متعلق جو تصور ہے وہ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ نسائیت کی ساری خصوصیات اس میں بھی کم و بیش اتنی ہی موجود ہے جو مشرقی عورت میں ہے۔ گو کلچر اور سماجی نظریات اور اصول بالکل مختلف ہو چکے ہیں۔ میں سوویت ممالک یعنی کیمونسٹ ممالک کی خواتین سے بھی ان کے گھر آنگن میں ملی ہوں اور سچ پوچھیے تو کیمونزم نے ان کا کچھ زیادہ نہیں بگاڑا۔ انھیں بھی اچھے ملبوسات اور زیورات وغیرہ سے دلچسپی ہے۔ وہ ٹریکٹر پر سوار کسان لڑکی کا جو امیج اسٹالن کے زمانے میں تخلیق کیا گیا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا ہے۔ میں ایک خاتون ہوں تو ظاہر ہے کہ ایک خاتون ہی کی طرح لکھوں گی۔ یہ سوال آپ کا بےوقوفی کا ہے۔

جمیل اختر:

ہوسکتا ہے، میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ کو پڑھا ہے اور جو کچھ میری سمجھ

میں آیا ہے میں اس پر سوال کر رہا ہوں۔ آپ کی نظر میں کچھ سوال بالکل بے وقوفی کے ہو سکتے ہیں۔ (ہنستے ہوئے) لیکن اس پر آپ ضرور روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

(قہقہہ) اچھا ٹھیک ہے! کیا خاص بات ہے؟

جمیل اختر:

لیکن آپ کے یہاں ڈومیننگ کردار زیادہ تر عورت کا ہے مرد جو ہیں ذیلی اور ضمنی کردار کے طور پر آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

کیوں نہیں جب ہمارا پوائنٹ آف ویو عورت کا ہے۔ ہم عورت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں دنیا کو۔ تو ظاہر ہے کہ ہم اسی کو PRESENT کریں گے۔

جمیل اختر:

آپ سے قبل اردو کے افسانوی ادب میں دو طرح کے کردار موجود تھے ایک راؤنڈ دوسرا سپاٹ کردار۔ آپ کے یہاں ان دونوں سے الگ ایک کردار ملتا ہے جسے ہم عہد ساز یا سائیکلک کردار کہہ سکتے ہیں۔ یہ کردار ایک پورے عہد کو سماجی اور تاریخی تسلسل میں پیش کرتا ہے اور پھر دوسرے عہد میں ایک نئی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اپنے اس کردار کو آپ کیا نام دیں گی؟ اس کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتلائیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

یہ جو آپ سائیکلک کردار کی بات کر رہے ہیں یہ محض ایک کردار ہے۔ گوتم نیلمبر آگ کا دریا میں۔ باقی کہیں نہیں ہے۔ اسے آپ نے میرے پورے ادب پر کیوں لادیا۔

جمیل اختر:

آپ کے افسانوں کے زیادہ تر کردار فارغ البال کردار ہیں اور دنیا کے تمام مسئلوں سے آزاد ہیں۔ ان سبھوں کے اندر یکسانیت ہے کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ سبھوں کے سوچنے سمجھنے کا

انداز ایک سا ہے، بہت کم کردار زندگی سے لڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، ورنہ زیادہ تر کردار عشق کے روگ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

(تعجب کے ساتھ) عشق کے روگ میں۔

جمیل اختر:

ہاں عشق کے روگ میں۔

قرۃ العین حیدر:

غلط ہے۔

جمیل اختر:

جن میں نہ تو جذبوں کا خلوص ہے نہ عشق کی وارفتگی۔

قرۃ العین حیدر:

یہ آپ بڑی غلط بات کہہ رہے ہیں، کون سے عشق کے روگ میں مبتلا۔ ذرا مجھے دو چار کرداروں کے بارے میں بتلائیں۔ عشق کے روگ کا تو میرے یہاں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

جمیل اختر:

یا اسے آپ محبت کہہ لیجئے۔

قرۃ العین حیدر:

محبت کہاں ہے؟ بتائیے۔

جمیل اختر:

کرداروں کے درمیان تو ہے نا۔ جو ایک خاص مرحلے پر جا کر رک جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! کون سے ہیں وہ کردار؟

جمیل اختر:

شادیاں بھی ہوتی ہیں تو پراسپکٹس کی تلاش میں۔

قرۃ العین حیدر:

تو پھر میں کیا کروں؟ اس میں کیا کر سکتی ہوں۔

جمیل اختر:

ٹھیک ہے! میں آپ کا پوائنٹ آف ویو جاننا چاہتا ہوں کہ یہ چیزیں ہیں آپ کے یہاں۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں ہیں۔ ٹھیک ہے؟

جمیل اختر:

کرداروں میں یکسانیت بہت پائی جاتی ہے۔ سب ہشاش بشاش ہیں خوش ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ زندگی سبھوں کے لیے ایک آرام دہ چیز ہے۔ جبکہ زندگی میں اور بھی چیزیں ہیں شامل۔ اس پر میں دراصل آپ سے کچھ جاننا چاہوں گا۔

قرۃ العین حیدر:

اس میں کیا خیال ہوگا۔ ارے زندگی میں جیسا تجربہ ہوا۔ کردار جس طرح میرے سامنے آئے میں نے جس طرح انھیں دیکھا ویسے ہی پیش کیا ہے۔ اس میں خاص بات کیا ہوگئی ہے؟

جمیل اختر:

دوسری طرف آپ کے کرداروں میں ایک طرح کی بے اطمینانی، خوف، زندگی سے فرار اور کچھ نہ ہونے کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ابھی آپ ایک طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ فارغ البال ہیں، خوش باش ہیں۔

جمیل اختر:

اس کے باوجود بے اطمینانی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ آپ خود CONTRADICT کر رہے ہیں۔ اگر وہ بشاش ہیں خوش ہیں تو پھر زندگی سے خوف زدہ کیوں ہیں؟

جمیل اختر:

آگے چل کر ہیں، افسانوں کے بعد...... یہ جو پہلے میں نے سوال کیا ہے یہ افسانوں کے سلسلے میں ہے۔ اس کے بعد جو آگے بڑھ رہا ہوں میں تو جو ارتقا کا مرحلہ آتا ہے اس میں یہ چیز آرہی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک ہے...... تو ہیں۔

جمیل اختر:

بے اطمینانی ہے ایک طرح کی۔

قرۃ العین حیدر:

کیوں نہیں ہوگی بے اطمینانی...... بے اطمینانی ہے...... جو کردار ہم پیش کر رہے ہیں اگر وہ بے اطمینانی کا شکار ہیں تو ہم بے اطمینانی بتائیں گے ان کی۔ تو بات کیا ہوئی۔

جمیل اختر:

آپ کے زیادہ تر کردار یا تو حالات کی رو میں بہہ جاتے ہیں یا حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ حالات کو بدلنے کا حوصلہ اور طاقت نہیں رکھتے۔ ایسا کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی! یہ تو کرداروں سے پوچھیے۔ ایسا کیوں؟ ایسا ہی ہوگا، ایسے ہی ہوں گے وہ کردار۔ آگے چلیے۔

جمیل اختر:

آپ کے زیادہ تر کردار مکمل کردار نہیں بن پاتے ہیں، بلکہ زیادہ تر کردار نامکمل اور ادھورا

ہے۔اس کی کیا وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

مکمل کا مطلب کیا ہے بھائی! آپ زندگی میں صبح سے شام تک مختلف قسم کے لوگوں سے ملتے ہیں جس میں آپ کے عزیز بھی ہیں، قریبی دوست بھی، شناسا بھی، ان میں سے کچھ کے لیے آپ کے VIBES اچھے ہوتے ہیں، کچھ کے بُرے اور چند کے نہ اچھے نہ بُرے، آپ ہر فرد کا تجزیہ کرنے نہیں بیٹھتے کہ یہ مکمل ہے یا نامکمل۔ ایسا آپ محض چند لوگوں کے لیے کر سکتے ہیں جن کو آپ بہت قریب سے جانتے ہیں۔ آپ کے خیال میں میرا ہر کردار نامکمل اور ادھورا ہے تو مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں نے اتنے افسانے لکھے ہیں اور ناول ان میں سے اتنے کردار ہیں کہ ان کا یاد رکھنا ناممکن ہے۔ اس میں مکمل اور نامکمل کی تخصیص بھی بہت مشکل ہے۔ آپ چند ایک کا نام لیجیے تو شاید میں بتلا سکوں۔

جمیل اختر:

جیسے گریسی کا کردار۔ یہ کردار میرے خیال میں مکمل کردار نہیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ جو ادھورا پن ہے یہ اس کا کردار ہے۔ اس کا میں کیا کروں۔ یہ کمی جو کردار کے اندر ہے اس کو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کو آپ برداشت کیجیے۔

جمیل اختر:

آپ کے یہاں عشق کی گرم بازاری کے باوجود جنس کا فقدان ہے، آپ کے تخلیق کردہ مختلف کردار اس سے دور بھاگتے نظر آتے ہیں۔ کیا آپ جنس کو شجر ممنوعہ سمجھتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! یہ باتیں چھوڑیئے یہ بہت پوچھا گیا ہے، جس طرح کا ماحول ہے، جس طرح کا کلچر ہے، جس طرح کی میری ٹریننگ ہے، جو میرا بیک گراؤنڈ ہے اس میں جنس کا تذکرہ یا جنس کی جس طرح آج کل باتیں کی جاتی ہیں، اس میں وہ نہیں تھی، اس میں یہ چیز شامل نہیں تھی۔ بس اس کو سمجھ سکتے آپ، اس کلچر کو اگر آپ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کیسی تھی تو چھوڑ دیجیے اس بات کو۔

جمیل اختر:

نہیں۔تھوڑی سی روشنی ڈال دیں تو بہتر ہے، طالب علموں کے لیے خاص طور سے۔

قرۃ العین حیدر:

کیا روشنی ڈالوں؟ ارے بھئی کیا روشنی ڈالوں؟ آج کل جس طرح کی گندگی نظر آرہی ہے، جس طرح کے لڑکے لڑکیاں گھوم رہے ہیں۔

جمیل اختر:

یعنی اس طرح کی OPENNESS نہیں تھی اس سوسائٹی میں۔

قرۃ العین حیدر:

اسے آپ OPENNESS کہیے یا بے راہ روی کہیے، وہ اپنا اپنا طریقہ ہے بات کرنے کا وہ نہیں تھی۔ جس بیک گراؤنڈ سے میرا تعلق ہے اس میں وہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے میں پھر اسی کے لحاظ سے نہ لکھوں گی۔

جمیل اختر:

آپ کے یہاں کرداروں کی رنگارنگی ہے۔ ان کی زندگی، ان کے سوچنے کے طریقے، ان کے نظریے تو سامنے آتے ہیں لیکن خود ان کرداروں کی خالق کی حیثیت سے آپ کا نقطۂ نظر سماج اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کی بنیادی وجہ کے بارے میں کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! ابھی تو آپ نے کہا کہ آپ کے سارے کردار ایک سے ہوتے ہیں، اب آپ کہہ رہے ہیں کہ ان میں وہ ہے۔

جمیل اختر:

نہیں۔ ان میں جو رنگارنگی ہے ان کے بارے میں۔

قرۃ العین حیدر:

ابھی تو آپ نے کہا کہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں، ابھی آپ نے پچھلے سوال میں......

جمیل اختر:

لیکن زندگی کے بارے میں جو ایک نظریہ ہے وہ سامنے نہیں آتا ہے، اس پر آپ پر کچھ روشنی ڈالیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

کیا زندگی کے بارے میں نظریہ ہے؟ زندگی کے بارے میں کس کا نظریہ سامنے نہیں آتا۔

جمیل اختر:

خود آپ کا۔ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں آتا بھئی! میری مرضی کہ میں نہیں پیش کرتی...... ٹھیک ہے۔

جمیل اختر:

ہر بڑے ادیب کے اسٹائل کی تقلید ہوتی ہے اور نئے لکھنے والے یا ہم عصر ادیب اس کے اسٹائل کی نقالی کرتا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں آپ کے اسٹائل کی تقلید ہوئی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے نہیں پتہ...... مجھے نہیں معلوم۔ میں اپنی تخلیقات کے بارے میں ہر وقت غلطاں و پیچاں نہیں رہتی کہ دیکھتی رہوں کہ کون میری تقلید کر رہا ہے یا نہیں کر رہا ہے۔

جمیل اختر:

آپ کے پورے فکشن میں حزن و یاس کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ تھا جو کھو گیا ہے اور جس کے کھونے کا اس قدر غم ہے کہ پوری فضا غم ناک ہو گئی ہے، اس کے پیچھے کون سی نفسیات کام کر رہی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کیا؟ حزن۔ ارے بھئی واہ۔ میری تو سمجھ میں ایسا نہیں آتا کہ میری یہاں حزن ہے...... غم ناکی...... ایسی غم ناکی نہیں ہے کہ پوری فضا غم ناک ہو گئی ہو۔ آپ کو ایسا لگتا ہو گا تو

الگ بات ہے۔ کہاں ہے غم...... یہ آپ کو لگ رہا ہوگا۔

جمیل اختر:

اکثر جگہ نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ زندگی میں حزن بھی ہے اور خوشی بھی دونوں چیزیں ہیں۔...... ہوگا۔

جمیل اختر:

آپ کے فکشن کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ آپ نے تاریخ کے تناظر میں عورت کے مقدر کو تھیم بنا کر اوّل سے آخر تک اس کے مسائل کو اجاگر کیا ہے اور مردوں کے ہاتھوں اس کے استحصال کی کہانی جو سیتا سے آج تک ہندستانی معاشرہ کر رہا ہے اسے موثر طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے سماج کو یا عورت کو آپ کیا پیغام دینا چاہتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

کوئی پیغام نہیں دینا چاہتی۔ میں کوئی لیڈر تھوڑے ہی ہوں کہ پیغام دوں۔

جمیل اختر:

اس تھیم، اس تسلسل کو کیا نام دیں گی آپ۔

قرۃ العین حیدر:

جو تھیم ہے۔ جو اصلیت ہے وہ ہم بیان کر رہے ہیں۔ پیغام کیا ہے اس میں۔ بھئی تھیم ہے۔ جو پڑھے گا سمجھ جائے گا کہ عورت کی بے بسی ہے اس میں۔ پیغام کیا ہے اس میں۔

جمیل اختر:

آپ نے میل شوزم کی شکایت بار بار کی ہے۔ جبکہ آپ پر اچھا یا برا اب تک جو بھی لکھا گیا ہے وہ لکھنے والے تمام ناقد مرد ہی ہیں۔ پھر یہ شکایت کیسی؟

قرۃ العین حیدر:

خاتون ناقد اب کوئی ہے ہی نہیں۔ ممتاز شیریں کے بعد اور کسی خاتون نے فکشن پر تنقید نہیں کی ہے۔ پاکستان میں نثار عزیز بٹ نے تھوڑا بہت لکھا ہے لیکن زیادہ نہیں۔ وہ بہت لائق خاتون ہیں اور اچھا لکھ سکتی ہیں۔ میل شوزم تو ہے اور میں اس بحث کو اور زیادہ بڑھانا نہیں چاہتی۔ مجھ پر ہونے والی تنقید کو اگر آپ غور سے پڑھیں تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ میرا کہنا درست ہے یا غلط؟ فی الحال اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی۔

جمیل اختر:

کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ اس مردانہ سماج نے ایک خاتون فکشن نگار کی حیثیت سے آپ کو نظر انداز کیا ہے یا وہ مقام و مرتبہ جو آپ کو ملنا چاہیے تھا نہیں دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں..........ایسا نہیں ہے..........ایسا سوچنا بالکل غلط ہے۔

جمیل اختر:

اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں..........ایسا نہیں..........بہت سے لوگوں نے جو میرے بارے میں لکھا ہے اس میں میل شوزم نہیں ہے۔ ایک ضروری بات جو میں بتانا چاہتی ہوں اور جس کا تذکرہ میں نے ہندستان میں اور ہندستان سے باہر ادبی کانفرنسوں میں یہ بطور خاص کیا ہے کہ ہندستانی مسلم معاشرے میں پردے کی قید و بند کے باوجود ایک عجیب و غریب حیرت انگیز روشن خیالی اور فراخ دلی یہ بھی تھی کہ جب خواتین نے اٹھارہ سو اسی کے آس پاس قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا تو مردوں کی طرف سے کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی۔ خواتین نے ناول بھی لکھے رسالے شایع کیے اپنی "Women's Lib" کی تحریک بھی زور و شور سے چلائی یہ ایک انتہائی، بے حد قابل ذکر بات ہے۔ مجھے یاد ہے ایک اور ہندستانی زبان کی ادیبہ نے مجھ سے کہا کہ آپ کے یہاں تو پردہ سسٹم تھا آپ

کو لکھنے میں بڑی مشکل پیش آئی ہوگی؟ میں نے جواب دیا کہ میری ماں اور نانی میری والد کی پھوپھی اکبری بیگم اپنے زمانے کی نامور ترین ناول نگار تھیں۔ جب انھوں نے لکھنا شروع کیا اور انھیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو آدھی صدی کے بعد میرے لیے کسی مشکل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اردو کلچر ایک نہایت روشن خیال اور فراخ دل کلچر رہا ہے۔ اب دیکھیے خواتین نے اردو میں علم بغاوت بھی بلند کیا۔ جیسے عصمت آپا۔ انھوں نے تکنیک کے نت نئے تجربے بھی کیے۔ انھوں نے مختلف متنازعہ فیہ موضوعات پر بھی لکھا اور انھیں لکھنے کی پوری آزادی رہی۔ لیکن اس کے باوجود اگر کہیں کہیں میل شونزم نظر آجاتا ہے تو اس کا تذکرہ کرنے میں کیا حرج ہے؟

جمیل اختر:

آپ نے اپنے فکشن میں عورت کو صرف عورت کے روپ میں گھر کی چار دیواری کے اندر مقید کر کے نہیں دیکھا ہے بلکہ ایک وسیع تر تصور میں کائنات کی تخلیق اس کی تعمیر اور اس کی ترقی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ قدم سے قدم ملا کر چلنے والی عورت کے روپ میں بھی دیکھا ہے۔ اس کے باوجود آپ کے یہاں عورت کی وہ روح ہے جو زماں و مکاں سے ماورا محبت کی تلاش میں ازل سے اب تک زماں نوردی کر رہی ہے، عورت کی وفا، خود سپردگی، قربانی، اس کی مظلومیت، اس کی محرومی، اس کی بدنصیبی، اس کی لاچاری، اس کی بے بسی اور اس کے سماج میں جگہ جگہ ٹھکرائے جانے کی داستان ہی ہر کہانی میں دہرائی گئی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ارے جب آپ نے خود ہی بتلا دیا تو وجہ کیا بتلاؤں میں۔ بے بسی، مجبوری، لاچاری، یہ جب ہے تبھی تو بیان کر رہی ہوں۔

جمیل اختر:

بار بار وہی چیز دہرائی جا رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہے.........تو دہرائی تو جائے گی۔ آپ نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔

جمیل اختر:

کیا آپ سمجھتی ہیں کہ عورت صرف محبت کرنے کے لیے ہی پیدا کی گئی ہے؟ جو مرد کی مختلف قسموں سے محبت کرنے کے بعد بھی ٹھکرا دی جاتی ہے، عورت پھر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی اور رشتے میں دائمی استحکام کی خاطر وہ بہت سے توہمات کرتی ہے۔ پیروں فقیروں کی چوکھٹوں پر متاعِ ہستی نذر کرتی ہے۔ نتیجہ پھر بھی غیر اطمینان بخش ہے، عورت کی یہ بے بس روح آپ کے پورے فکشن پر حاوی ہے۔ کہیں بھی وہ اس سے باہر نکلتی نظر نہیں آتی، صرف ایک ویلنٹینا کے جو اس وقت خلا کے سفر میں مصروف ہے۔ اس سے عورت کی کون سی تصویر آپ اُجاگر کرنا چاہتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی میں تو اُجاگر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر آپ کہہ رہے ہیں کہ اجاگر ہوا ہے، تو ہے۔ آپ کی سوسائٹی میں ہے بے بس۔ مغرب کی سوسائٹی میں بھی بے بس ہے میں جانتی ہوں مغرب کو بھی............

جمیل اختر:

خیر آپ کا مغرب کا مطالعہ تو ہے ہی بہت وسیع۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! میں مغرب کی سوسائٹی کو بھی جانتی ہوں وہاں بھی عورت بہت بے بس ہے۔

جمیل اختر:

آج بھی۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! آج بھی۔ وہاں بھی بے بس ہے اور یہاں بھی بہت سی باتوں میں بے بس ہے۔

جمیل اختر:

کچھ اور اس پر روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! کیا روشنی ڈالوں؟ پورا مضمون لکھوں کیا؟

جمیل اختر:

آپ کے یہاں مغرب کی عورت ہو یا مشرق کی، طوائف ہو یا خاندانی بیگم، یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، ایک عورت کی حیثیت سے سبھوں کے مسائل تقریباً ایک سے ہیں۔ جس کا آپ نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اس پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

جب میں نے خود ہی اعتراف کرلیا ہے تو پھر کیا کہوں؟ آپ تو خود ہی کہہ رہے ہیں۔ تو اب میں کیا کہوں، آپ نے تو خود ہی بیان کر دیا ہے۔

جمیل اختر:

آپ کے فکشن میں موت کا تصور بہت چھایا ہوا ہے، کیا یہ موت معاشرے کی علامتی موت تو نہیں؟ جس میں تہذیب و معاشرت سبھی کچھ شامل ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی نہیں...... دیکھیے موت جو ہے زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے جو اس کو اگنور کرتا ہے اس سے نظریں چراتا ہے وہ بے وقوفی کرتا ہے، ہر وقت انسان کو اس کو یاد رکھنا چاہیے۔ اسلام میں ہے کہ دن میں ستر بار موت کو یاد کرو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ میں نے کوئی انوکھی بات لکھی ہے۔

جمیل اختر:

آپ کے یہاں نشاطِ زیست کی آسائشوں کے باوجود زندگی بھر پور نہیں ہے۔ بلکہ ایک کرب انگیز یاسیت ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ ایک محرومی کا احساس ہے اور زندگی رنج و غم اور درد و محن کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ایسا نہیں......ایسا تو نہیں ہے...... یہ آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں کہاں دردوغم کا مجموعہ بن کے رہ گئی ہے۔

جمیل اختر:

ناولوں میں بھی یہ احساس ملتا ہے مطالعے کے دوران۔

قرۃ العین حیدر:

ایسا تو نہیں ہے کہ جسے آپ کہیں گے کہ ٹوٹلی دردوغم کا مجموعہ ہے، میں کوئی علامہ راشد الخیری تو نہیں ہوں۔ دردوغم کا مجموعہ ہے۔ یہ جو کچھ نقادوں نے لکھا ہے وہ آپ کے ذہن میں ہے۔ اسی کو آپ ریپیٹ کر رہے ہیں۔

جمیل اختر:

نہیں، دراصل میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے جو کچھ پڑھا ہے اور جہاں جہاں مجھے جس طرح کی بات سمجھ میں آئی ہے یہ سوالات دراصل اس طرح کے ہیں، ناقدوں والے سوالات نہیں ہیں آپا۔ یہ میں دراصل اپنے سمجھنے کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ یہ سب طالب علمانہ سوالات ہیں۔ ہوسکتا ہے اس میں کچھ غلط باتیں بھی ہوں تو اس کو نظر انداز کر دیجیے۔

قرۃ العین حیدر:

(ہنستے ہوئے) اچھا۔ ٹھیک ہے، ہاں، ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہے۔

جمیل اختر:

آپ کے فکشن میں موت کہیں تو زندگی کے تسلسل کے معنی میں استعمال ہوئی ہے اور کہیں مرمر کے جیے جانے کے معنی میں اور کہیں موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے اور کہیں موت سے آپ نے خوف زدہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے، اس کی کیا فلسفیانہ تعبیریں ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی آپ نے خود ہی بیان کر دیا ہے۔ اس کی فلسفیانہ تعبیریں میں کیا بیان کروں۔ ایک چیز میں نے لکھ دی، ہو گیا، لکھ دیا اب آپ کو اس کی تعبیر کیا بیان کروں؟

جمیل اختر:

کسی بھی بیان کے پیچھے کچھ منطق ہوتی ہے، کچھ فلسفہ ہوتا ہے۔ کہیں آپ نے موت سے ڈرایا ہے۔ کہیں تسلسل کے معنی میں لیا ہے، تو اس کے پیچھے............

قرۃ العین حیدر:

ہو گیا جب اس کا میسج مل گیا آپ کو تو پھر دوبارہ کیا بیان کروں؟ آپ نے پڑھا۔

جمیل اختر:

اس سے الگ ہٹ کر بھی کوئی معنی ہے آپ کے ذہن میں............

قرۃ العین حیدر:

نہیں......آپ نے پڑھا اور آپ کے ذہن میں یہ خیالات ہیں۔ ٹھیک ہے آپ سمجھ گئے تو اس میں اور کیا بتاؤں آپ کو؟

جمیل اختر:

کیا آپ بھی ٹالسٹائی کی طرح موت کو سب سے اٹل سچائی مانتی ہیں اور انسانی وجود کے لیے اسے ناگزیر سمجھتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

ناگزیر تو ہے۔ یہ کیا بے وقوفی کا سوال آپ کر رہے ہیں؟ دنیا سمجھتی ہے میں کیا سمجھتی ہوں۔ اب آپ کہیں کہ آپ پانی پینا ناگزیر سمجھتی ہیں؟ ارے بھئی دنیا پانی پینا ضروری سمجھتی ہے۔ اس میں میں کیا سمجھتی ہوں۔

جمیل اختر:

اسی سے لگتا ہوا ایک سوال اور ہے۔ وقت کا ایک مظہر زندگی اور دوسرا موت ہے۔ موت

عرفان حیات کی تکمیل ہے۔ساتھ ہی ساتھ وجود کے تسلسل ہی کا ایک مرحلہ ہے۔اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے اس کو تسلسل اور تبدیلی دونوں ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! آپ نے خود ہی جواب دے دیا تو میں کیا جواب دوں؟

جمیل اختر:

کیا آپ نے اسے تبدیلی اور تسلسل دونوں کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی..........میں نے کیا ہوگا..........آپ جب خود جواب دے رہے ہیں سوال کا تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔

جمیل اختر:

آپ کی تحریروں سے ایسا لگتا ہے کہ آپ آج بھی فیوڈلزم کی طرف دار ہیں جبکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ یہ نظام اب لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ بہت بے وقوفی کی بات آپ کر رہے ہیں، یہ کہاں پڑھا ہے آپ نے۔تحریروں سے کہاں لگتا ہے ایسا؟

جمیل اختر:

آپ کے فکشن ہی سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے،اس لیے کہ آپ نے فیوڈلزم کی تعریف میں کافی لکھا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اگر فیوڈلزم ابھر کر آتی ہے تو ٹھیک ہے اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے۔

جمیل اختر:

لیکن آپ آج تو طرف دار نہیں ہیں اس نظام کی۔

قرۃ العین حیدر:

صاحب پہلے کب تھی طرف دار میں یہ تو بتائیے۔

جمیل اختر:

ہاں! تو اسی پر روشنی ڈالیے۔

قرۃ العین حیدر:

میں بے وقوفی کے سوال پر روشنی ڈال کے کیا کروں؟

جمیل اختر:

آپا اگر میں نے بے وقوفی کا سوال کر دیا ہے تو اسے کلیئر کر دیجیے۔

قرۃ العین حیدر:

فیوڈلزم کی طرف دار کب تھی میں یہ سوال آپ کا نہایت بے وقوفی کا جاہلانہ ہے۔ کیا ثبوت آپ کے پاس ہے کہ فیوڈلزم کی طرف دار ہوں، کہاں ہے ثبوت؟ سنی سنائی بات کر رہے ہیں نا آپ، جو کچھ لوگوں نے پرسنل گفتگو میں کہی ہے وہی آپ ریپیٹ کر رہے ہیں، یہ میں پسند نہیں کرتی۔ یہ جو آپ لوگ کرتے ہیں اور جس میں آپ لوگ سنی ہوئی باتیں ریپیٹ کرتے ہیں۔ فیوڈلزم کی طرف دار یہ آپ نے بہت بڑا الزام لگایا ہے، کہاں آپ نے پڑھا ہے؟ آپ ثبوت دیجیے؟

جمیل اختر:

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی تحریریں یاد ماضی سے بھری پڑی ہیں اور آپ اپنے ماضی کی تعیش پسندی اور شان وشوکت پر آنسو بہاتی نظر آتی ہیں اور خود کہتی ہیں کہ اپنے خاندان کی ان شاندار روایات کے متعلق سوچ کر ہم بے حد دکھ کے ساتھ آہیں بھرتے ہیں اور پکار اٹھتی ہیں، ہمارا ماضی، ہمارا ماضی، ہمارا خاندان، ہمارا خاندان، ہمارا خاندان۔

قرۃ العین حیدر:

یہ میں نے کہاں لکھا ہے؟

جمیل اختر:

یہ آپ کی تحریر ہے۔ اور یہ جملہ آپ کے افسانے میں موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ لکھا ہے میں نے ہمارا خاندان۔ ہمارا خاندان، کہاں ہے نکالیے؟

جمیل اختر:

یہ تحریر آپ کی ہے۔ یہ جملے آپ کے ہیں جو میں کوڈ کر رہا ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

کون جملہ ہے؟

جمیل اختر:

ہمارا ماضی، ہمارا خاندان۔

قرۃ العین حیدر:

کہاں ہے؟ کون سی تحریر ہے؟ نکالیے۔

جمیل اختر:

یہاں پر تو میں لے کے نہیں آیا ہوں، مگر یہ جملہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کو کتاب دکھا سکتا ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، ہمارا ماضی، ہمارا خاندان اگر میں نے لکھا ہے تو طنزیہ لکھا ہوگا۔

جمیل اختر:

ٹھیک ہے۔ ہوسکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں نہیں۔ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ غلط بات ہے۔ آپ ہمیں ثبوت دکھائیے کہاں سے آپ نے نکالا ہے۔

جمیل اختر:

ٹھیک ہے میں آپ کو دکھادوں گا۔

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک ہے۔ جی ہاں۔

جمیل اختر:

اسی سے لگتا ہوا ایک سوال اور ہے کہ ماضی سے جب آپ اپنے حال کی طرف نظر کرتی ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! یہ سوال اتنی مرتبہ ہوئے کہ پٹ گئے ہیں۔ کیا سوال کرر ہے ہیں آپ؟ کوئی نیا سوال نہیں کرر ہے۔ کوئی IMAGINATION نہیں ہے آپ کے اندر کوئی نئی بات نہیں کرر ہے ہیں آپ وہی سوال جو پچھلے پچاس سال سے لوگ کرتے آئے ہیں، کوئی نئی بات نہیں پوچھ رہے ہیں۔ اب تک نہیں پوچھی ہے آپ نے۔ وہی ریپیٹ کرر ہے ہیں جو لوگ کرتے آئے ہیں ماضی کی اور فلانا...... ارے کہاں...... ماضی...... بھئی یہ بات آپ نے کہاں دیکھی ہے۔ ہمارا ماضی۔ ہمارا خاندان یہ بات ہمیں نکال کر دکھایئے۔

جمیل اختر:

اچھا ٹھیک ہے۔ میں آپ کو دکھلا دوں گا۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اپنا لکھا ہوا خود ہی بھول رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! مجھے بالکل بھی یاد نہیں پڑتا کہ یہ میں نے لکھا ہے۔

جمیل اختر:

آپ کی زندگی میں اپریل کا مہینہ کیا کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس مہینے کا ذکر بار بار آیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ایلیٹ کی ایک نظم ہے اپریل کے بارے میں کہ اپریل کے مہینے میں..........

جمیل اختر:

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ کے والد کا انتقال بھی اسی مہینے میں ہوا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! اپریل میں والد کا انتقال ہوا تھا۔ ٹھیک ہے۔

جمیل اختر:

شاید اس حوالے سے بھی اس کو ریپیٹ کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! ہاں۔ وہ بھی ہے۔

جمیل اختر:

آج پوری دنیا کا ادب ناسٹلجیا سے بھرا ہوا ہے۔ انتقال آبادی نے جس تیزی کے ساتھ ملکوں کے تہذیبی حالات تبدیل کر دیے ہیں، اس سے ناسٹلجیا کا پیدا ہونا فطری ہو گیا ہے، میرے خیال میں ہجرت ہی بنی نوع انسانی کا سب سے پہلا ناسٹلجیا ہے آپ کا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میرا کیا خیال ہے جو آپ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ارے بھئی! ناسٹلجیا کے بارے میں جو میں نے لکھا ہے وہی میرا خیال ہے، ہزار بار میں اس کو کہہ چکی ہوں، کوئی نیا خیال تو ہے نہیں جو میں آپ کو بتاؤں نئی بات کیا بتاؤں؟

جمیل اختر:

آپ کے فکشن کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں ضابطۂ حیات کی بے حد کمی ہے جس کی وجہ سے آپ کی تخلیقات اور آپ کے کرداروں میں ایک بے یقینی کی کیفیت ملتی ہے، اس بارے میں آپ کچھ وضاحت کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

ہوسکتا ہے ہو...... ہوسکتا ہے وہ کمی جو آپ بتلا رہے ہیں۔ ضابطۂ حیات کی کمی کیا ہوتی ہے، آپ مجھے بتلائیے...... ہاں بتائیے۔

جمیل اختر:

زندگی کے متعلق کوئی ایک خاص نظریہ اور اس کی پیش کش یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملتی۔

قرۃ العین حیدر:

کیا نظریہ.......... مجھے بتائیے.......... کیسا نظریہ؟

جمیل اختر:

انسان ایک نظریے کے تحت کسی چیز کو لکھتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کی ایک خاص اپروچ ہوتی ہے۔ یہ چیز آپ کے یہاں نہیں ہے۔ جو بات کھٹکتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

کیا ہے مجھے بتائیے! آپ چند رائٹرز کے نام لیجیے اور مجھے بتائیے کہ ان کے یہاں کیا اپروچ ہے۔ بتائیے مجھے تاکہ میں دیکھوں کہ میرے یہاں کیا کمی ہے کیا اپروچ نہیں ہے۔

جمیل اختر:

کیا آپ اپنے آپ سے مطمئن ہیں کہ آپ نے جو کچھ پیش کیا ہے؟ ٹھیک ہے۔ اور ایک ضابطے کے تحت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں میں مطمئن ہوں اور مجھے EXPLAIN کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جمیل اختر:

ٹھیک ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں نہیں مجھے چند لوگوں کے نام بتائیے کہ ضابطۂ حیات کن لوگوں کا ہے اور کس طرح

پیش ہوا ہے، نام بتایئے نا۔ تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ کس کس کے یہاں ضابطۂ حیات ہے اور وہ کیسے پیش ہوا ہے، دکھایئے۔ دکھایئے اور رائٹرز کو جو آپ نے پڑھا ہے تو کیا ضابطۂ حیات آپ نے دیکھا۔

جمیل اختر:

ہر رائٹر کے یہاں کوئی نہ کوئی ضابطۂ حیات ہوتا ہے، زندگی کے بارے میں اس کی ایک خاص اپروچ ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی اسلامی نظریہ سے متاثر ہے تو وہ اس کو سامنے رکھ کر لکھتا ہے اور اس کی تمام تر اپروچ اسلامی ہوتی ہے۔ مثلاً ترقی پسندوں نے ایک خاص نظریئے کے تحت لکھا اور ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تیار ہوا اور ادیبوں کے ایک بہت بڑے حلقے کو اپنا ہم خیال بنالیا اور سماج کے ایک بڑے طبقے کی اپروچ بدل دی اسی طرح سے جدیدیوں نے بھی اپنے نظریے کے تحت ایک پورا گروپ تیار کیا اور ادب میں افراتفری مچادی۔ آج کل مابعد جدیدیت کا نظریہ ادیبوں کو لبھانے پر لگا ہوا ہے، دراصل میری مراد ان نظریوں کی طرف تھی۔

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک ہے.........ہو جاتا ہے.........میرا نہیں ہے۔

جمیل اختر:

آپ کی تخلیقات سے ایسا لگتا ہے کہ آپ کا مقصد انسانی المیہ کی پیش کش ہے۔ آپ نے انسانی ٹریجڈی کی تاریخ بیان کی ہے اور اس کے لیے تہذیب و تاریخ کا سہارا لیا ہے، لیکن زندگی صرف المیہ نہیں ہے اس میں طربیہ عناصر بھی ہیں جو صرف راگ رنگ، گراموفون، فلمی دھنیں ہی نہیں بلکہ اس سے الگ آسودگی اور اطمینان بھی ہیں یہ چیزیں آپ کے یہاں کیوں نہیں؟

قرۃ العین حیدر:

آپ نے المیہ کہاں استاد یکھ لیا بھئی.........طربیہ کہیں نہیں دیکھا آپ نے۔

جمیل اختر:

یہ کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ ویسے یہ میرے اپنے محسوسات ہیں، ممکن ہے آپ کے خیال میں غلط ہوں۔ اس میں جہاں جہاں غلط فہمی ہے اسے دور کر دیں آپ۔

قرۃ العین حیدر:

ایسے کہاں ہے زیادہ.........طربیہ کوئی نہیں ہے؟ کہیں نہیں ہے؟

جمیل اختر:

اس کی کمی نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اے ہے، رونا پیٹنا بہت ہے۔

جمیل اختر:

کچھ اس طرح کا انداز ملتا ہے۔ یہ چیز حاوی نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

طربیہ کہیں نہیں ہے؟ خوشی کہیں نہیں ہے؟

جمیل اختر:

کہیں کہیں ہے لیکن المناکی نے اسے ابھرنے نہیں دیا ہے۔ سسکیاں زیادہ سنائی پڑتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

گویا یہ چیز حاوی نظر آتی ہے۔

جمیل اختر:

جی ہاں!

قرۃ العین حیدر:

اگر آپ کو نظر آتی ہے تو ہوگی، اگر غم ناکی زیادہ ہے تو وہ تو آئے گی۔ سماج میں اور ماحول

میں اگر غم نا کی ہے تو وہ تو آئے گی۔

جمیل اختر:

''کار جہاں دراز ہے'' کو آپ نے سوانحی ناول کہا ہے اور اس میں جہاں آپ نے پورے خاندان کی تاریخ درج کر دی ہے وہیں آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے اس کی وجہ؟ اور جو کچھ لکھا ہے اس سے آپ کی مکمل تصویر نہیں بنتی کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

اپنے بارے میں نہیں لکھا ہے سب لکھا ہے۔

جمیل اختر:

دو حصے جواب تک چھپ چکے ہیں، اس سے آپ نکل کر سامنے نہیں آتی ہیں آپا۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے بعض لوگ ہوتے ہیں جو خود نمائی چاہتے ہیں، بعض ہوتے ہیں جو خود نمائی نہیں چاہتے ہیں، میں خود نمائی نہیں چاہتی۔ بس ختم ہو گئی بات۔

جمیل اختر:

'کار جہاں دراز ہے' کو آپ نے نان فکشنل ناول کہا ہے، لیکن 'کار جہاں دراز ہے' میں جہاں ایک طرف سچائی بیان کی گئی ہے وہیں دوسری طرف سچائی کو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے کہ بقول ظ انصاری جسے دیکھو باون گز کا اور جس کا قد اتنا اونچا نہیں اس کی پگڑی یا شلوار اتنے گز کی ہوگی؟ تو پھر یہ نان فکشنل کیسے ہوا؟ وضاحت کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

ظ انصاری کوئی خداوند تعالیٰ نہیں تھے۔ ظ انصاری ایک بڑے نیک انسان تھے، خدا بخشے انھیں، ان سے ہی پوچھیے کیا لکھا ہے انھوں نے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے.......... کس کو بڑھا چڑھا کے پیش کیا ہے؟ دیکھیے بعض لوگوں کا مزاج ہوتا ہے دوسروں کو گرانا۔ دیکھیے آپ رائٹرز کا تذکرہ لکھ رہے ہیں، اپنے رشتہ داروں کا، اپنے دوستوں کا تو آپ کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کا قد

اونچا رہے اور اور دوسرے چھوٹے رہیں۔ میرا رویہ یہ نہیں ہے۔ سمجھ گئے آپ۔

جمیل اختر:

جی!

قرۃ العین حیدر:

تو یہ چیز جو ہے اس کو لوگ نہیں سمجھتے کہ سب کے لیے میرا رویہ ANTY نہیں ہے۔ اس چیز کو لوگ نہیں سمجھتے۔ ہمارے یہاں جو لوگوں کا رویہ ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں کی پگڑی اچھالنا، ان کو چھوٹا کہنا، ان کو نیچا دکھانا، ان کے بارے میں غلط بیانی سے کام لینا، ان کا مذاق اڑانا۔ یہ جو ہمارے اردو والوں کا رویہ ہے وہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے، میرا رویہ ان لوگوں سے مختلف ہے۔ میں نہ کسی کی بُرائی کرتی ہوں نہ کسی کی پگڑی اچھالتی ہوں، میں جہاں تک ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی تعریف ہی کرتی ہوں، اس چیز کو لوگ نہیں سمجھتے۔ یہ اپنا اپنا مزاج ہے۔

جمیل اختر:

یوں تو آپ اپنے فکشن میں چھوٹے بڑے تمام واقعات کو زیر بحث لائی ہیں اور اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ''آگ کا دریا'' جس میں ہندستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ بیان کی گئی ہے، اس میں تمام ادوار کا تو آپ نے مکمل احاطہ کیا ہے لیکن دور مغلیہ کا ذکر آپ نے ضمناً کیا ہے۔ جبکہ ہندستان کی تاریخ میں یہ دور تہذیبی اور تاریخی دونوں اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

صحیح ہے...... دیکھیے میں ہسٹری کی کورس بک نہیں لکھ رہی تھی۔ میں پانچ ہزار سال کی تاریخ کو نہیں لکھ رہی تھی۔ میں نے وہ سلیکٹو چیپٹرس لیے جس سے لگا کہ میری کہانی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے وہ...... اب میں پورا مغل دور لیتی...... میں پورا پٹھان پیریڈ لیتی، اتنا نہیں کیا میں نے۔

جمیل اختر:

ہاں یہ چیز بہت کھٹکتی ہے لوگوں کو اور اکثر آگ کا دریا پر تذکرے کے دوران یہ بات

آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اب کھٹکتی ہے تو کھٹکے۔ میں نے وہ پیریڈ لیے جو میرے خیال میں بہت اہم تھے، کمپنی کا پیریڈلیا۔ اس سے پہلے کا بھی پیریڈ لیا میں نے، دیکھیے نا میں شاہ جہاں، اورنگ زیب، جہانگیر شروع کرتی بیٹھ کے تو یہ میں نے نہیں کیا۔ دیکھیے ایک چیز ہوتی ہے سلیکٹو۔

جمیل اختر:

کار جہاں دراز ہے میں جہاں آپ نے حقیقی کرداروں کو پیش کیا ہے وہیں آپ نے ایک غیر انسانی کردار بھی پیش کیا۔ یہ کردار برادر موش یعنی ایک چوہا ہے جو کسی زاہد کی طرح آپ کو بار بار تلقین بھی کرتا ہے، یہ علامتی کردار آپ نے کیوں تخلیق کیا اور اس سے کیا کام لینا چاہتی تھیں۔

قرۃ العین حیدر:

ایسے ہی تخلیق کیا؟ ایک کنسٹرل گیا۔ ایک کنسٹری کرنے والا ل گیا۔ بس اس سے زیادہ اور کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔

جمیل اختر:

گویا کہ سماج پر طنز و استہزا کے لیے آپ نے اس کردار کو تخلیق کیا اس کو آپ کسی اور طریقے سے بھی پیش کرسکتی تھیں۔

قرۃ العین حیدر:

کیسے جو میری سمجھ میں آیا میں نے وہ کیا۔ بھئی تھوڑا سا IMAGINATION ابھی استعمال کیجئے، جب آپ کریٹیو کام کر رہے ہیں تو تھوڑا سا IMAGINATION بھی استعمال کیجیے مکھی پہ مکھی مت ماریئے۔ یہ کیا بات ہوئی کیوں برادر موش کو تخلیق کیا۔ ارے بھئی یہ تو ایک کرئیٹو کام ہے۔

جمیل اختر:

ان سوالوں کا اصل میں مقصد یہ بھی ہے کہ میری تفہیم میں جہاں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے

آپ کے اشاروں سے شاید میں حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں؟

قرۃ العین حیدر:

صحیح بات ہے.....ٹھیک ہے صحیح ہے۔

جمیل اختر:

آپ کے کردار (عورت مرد اور لڑکے، لڑکیاں) آپس میں محبت تو کرتے ہیں، اور جذبے میں شدت بھی پیدا ہوتی ہے، لیکن روحوں کا ملاپ نہیں ہوتا اور محبت کا جذبہ اپنے مقصد کو پانے میں ناکام ہے اور ازلی و ابدی محرومی ہی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے؟ ایسا کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

اوہ ہو! ارے بھئی یہ روحوں کا ملاپ ولاپ چھوڑیئے۔ میں یہ سب نہیں کرتی، ان چکروں میں مت پڑیئے، روحوں کا ملاپ جیسا میری سمجھ میں آتا ہے ویسا میں لکھتی ہوں یہ کیا بات ہوئی، ایسا کیوں نہیں کرتیں؟ ویسا کیوں نہیں کرتیں؟ نہیں کرتی، مرضی میری۔

جمیل اختر:

آپا اس سے ایک محرومی کا احساس تو ابھر کے سامنے آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تو مت پڑھیے۔ چھوڑیے۔

جمیل اختر:

نہیں، نہیں پڑھنا تو ہے، بہر حال۔ لیکن یہ ہے کہ جو میں نے محسوس کیا وہ عرض کر رہا ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

— ٹھیک ہے، مت پڑھیے۔

جمیل اختر:

''جلا وطن'' یہ تو آپ کے ایک افسانے کا عنوان ہے لیکن آپ کے زیادہ تر کردار ابدی و ازلی جلاوطنی کا دکھ بھوگتے نظر آتے ہیں، جلاوطنی کا مسئلہ بھی آپ کے یہاں المیہ بن کر ابھرا ہے۔

ذرااس کی وضاحت فرمائیں گے۔

قرۃ العین حیدر:

کیا فرمائیں۔کیا وضاحت فرمائیں؟ یہ ہے..... جلاوطنی آج کل ساری دنیا میں ہے، ہر شخص اپنے آپ کو Exile (اکزائل) سمجھتا ہے۔اپنے ماحول سے، اپنی سیاست سے، اپنے ملک سے، پوری دنیا میں پہلے جو لوگ اپنے گھروں میں اپنی فیملی اور والدین کے ساتھ رہتے تھے اب وہ نہیں رہا۔اب ہر شخص کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے۔یہ ایک عالم گیر المیہ ہے۔

جمیل اختر:

آپ کے افسانے کا ایک جملہ ہے۔''زندگی انسانوں کو کھا گئی صرف کاکروچ باقی ہیں'' اس جملے کی فلسفیانہ تعبیر آپ کے نزدیک کیا ہے۔کہیں یہ تو نہیں کہ تمام موجودات میں صرف انسان ''زمانی وجود'' رکھتا ہے اس لیے وہ وجودیاتی ہستی ہے کاکروچ اس لیے باقی رہیں گے کہ ان کا کوئی زماں نہیں، کیونکہ انھیں حس زماں حاصل نہیں۔دوسرے یہ کہ آج سائنسی تجربات نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نیوکلیئر بم سے دنیا کی تباہی کے بعد صرف کاکروچ باقی رہیں گے اس لیے کہ اس کی ساخت اس بم کے زہریلے اثرات سے متاثر نہیں ہوگی یا اور کوئی مطلب ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں اس کا یہی مطلب ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔آپ نے صحیح سمجھا ہے۔دیکھیے بھئی جب آخری دھماکہ ہوگا ایٹم بم کا جو ایک جاندار بچے گا وہ کاکروچ ہوگا۔آپ نے صحیح کہا ہے کہ اس کی ساخت اس بم کے زہریلے اثرات سے متاثر نہیں ہوگی۔لیکن اس میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ آخری جملہ لکھا تھا تو مجھے اس وقت تک سائنس کی حیثیت معلوم نہیں تھی کہ آخری دھماکے کے بعد محض کاکروچ زندہ رہیں گے۔

جمیل اختر:

آخر شب کے ہم سفر میں بنگال کی جو مرقع کاری آپ نے کی ہے اس میں وہ رچاؤ بساؤ اور فطری بے ساختگی نہیں جو اودھ کی تصویر کشی میں ہے۔اس ناول میں تہذیبی فضابندی کی شعوری

کوشش دیکھنے کوملتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ظاہر بات ہے کہ بنگال میرا وطن نہیں تھا۔تو میں اس کے بارے میں اس طریقے سے نہیں لکھ سکتی نا۔اسپون ٹینی ٹیس۔

جمیل اختر:

لیکن آپ بہت دنوں تک تو رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر؟

بہت تھوڑا تھوڑا کر کے۔کبھی ایک یادو مہینے سے زیادہ نہیں رہی۔

جمیل اختر:

آخرشب کے ہم سفر کو ترقی پسندوں نے ترقی پسندی کا مخالف ناول قرار دیا ہے،شاید اس لیے کہ اس ناول میں آپ نے ترقی پسندوں کی مصلحت اور مصالحت پسندی سے پردہ ہٹا کر حقیقت آشکارا کردی ہے اور یہ سچائی ان کو ہضم نہیں ہوسکی یا کوئی اور بھی وجہ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہی وجہ ہے۔اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

جمیل اختر:

ناول کا یہ جملہ کہ ''کل کے باغی آج کے اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو چکے ہیں۔تم آج کی باغی ہو۔ممکن ہے تم کل کے اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو جاؤ۔یہ جملہ یقیناً ترقی پسندوں یا انقلابیوں کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے اور نام نہاد انقلابوں پر گہرا طنز۔کھوکھلی ترقی پسندی کی قلعی کھول کر آپ نے ان کے تصور انقلاب کو سطحی اور نمائشی بتلا کر جس طرح ان کی تطہیر کی ہے کیا ان کی ناراضگی حق بہ جانب نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

مجھے کیا معلوم؟ یہ تو آپ ان سے پوچھئے کہ آپ کو بُرا لگا کہ نہیں لگا۔مجھ سے کیا پوچھ رہے

ہیں؟ مجھے کیا معلوم؟

جمیل اختر:

ہندستان میں بھی بہت سے ترقی پسند ہیں جو آپ کے قریب رہے ہیں جو بعد میں اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن گئے ان میں سردار جعفری اور دوسرے حضرات شامل ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کچھ کہنا پسند کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

کیا کہوں؟ دیکھیے کسی خاص شخص کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی۔ کوئی اور سوال کیجیے۔

جمیل اختر:

آپ کا ناول ''گردش رنگ چمن'' غالب کے اس مصرع سے لیا گیا ہے ۔ ''گردش رنگ چمن، ہے ماہ دسال عندلیب'' اور ناول کا اہم کردار عندلیب بانو بھی اسی مصرع سے لیا گیا ہے اور اس کی سرگذشت کو ماہ دسال عندلیب تصور کر کے ایک وسیع تناظر میں گردش رنگ چمن کی روداد بیان کی گئی ہے۔ کیا اس ناول کا محرک غالب کا یہی مصرع ہے؟ یا کوئی اور چیز۔

قرۃ العین حیدر:

یہی ہے......یہی ہے۔

جمیل اختر:

اس پر ذرا کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

کیا تفصیل سے روشنی ڈالوں؟ آپ کچھ پوچھیں تو بتاؤں۔

جمیل اختر:

مطلب یہ ہے کہ یہ مصرع آپ کو اتنے سارے ڈائمنشن کی طرف لے گیا جس سے اس ناول کا وجود گویا ہو گیا۔ اس مصرع کو پڑھنے کے بعد آپ کو وہ باریکیاں مل گئیں جس سے پلاٹ کا سارا تانا بانا تیار ہو گیا اور اتنا ضخیم ناول تیار ہو گیا۔

قرۃ العین حیدر:

مل ہی گیا ہوگا؟ جب ہی لکھا ہوگا۔

جمیل اختر:

آپ کا یہ ناول "گردشِ رنگ چمن" طوائف کلچر کا نمائندہ ناول کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے اس ناول میں طوائف کو موضوع بنا کر اس عہد کی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ موضوع آپ کے بقیہ ناول سے الگ اور نیا ہے، لیکن تاریخی تسلسل کی ایک کڑی ضرور ہے۔ میرے خیال میں اس عہد کی تہذیب و ثقافت کی داستان اس موضوع کے بغیر نامکمل رہتی شاید اسی لیے آپ نے اس موضوع کو اہمیت دی ہے (مرزا رسوا کا ناول امراؤ جان پر جذبی کی نظم "طوائف" سے ہٹ کر پہلی بار سنجیدگی سے طوائف کے کردار کو ایک نئے زاویے سے آپ نے پیش کیا ہے) تو اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہی وجہ ہے جس کو آپ نے صحیح سمجھا ہے۔

جمیل اختر:

اس ناول کے آخر میں ایک اور نیا پہلو اُبھر کر سامنے آیا ہے اور وہ بارہ بنکی کے ایک صوفی صاحب کا تذکرہ ہے، جسے آپ نے دیہات اور قصبوں کی خانقاہی تہذیب کے حوالے سے ایک زندہ حقیقت قرار دیا ہے، کیا تہذیبی انحطاط و انتشار کے اس دور میں عالمی سطح پر پھیلی سیاسی بدامنی، تشدد پسندی، اخلاقی زوال اور بظاہر بھرپور اور ہنگامہ خیز دنیا میں فرد کی تنہائی اور نروان اور سکون کی تلاش میں ان جگہوں پر متزلزل عقیدہ والے لوگوں کی بے چین روح کو آپ نے کوئی معنی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے کہ اس سے قبل بھی آپ اپنے افسانہ قلندر میں اقبال بخت سکینہ کے ذریعے اس کی ایک جھلک دکھلا چکی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

لوگ جاتے ہیں، وہاں ان کو سکون ملتا ہے، یہ کوئی خاص بات نہیں ہے، نئی بات نہیں ہے۔

جمیل اختر:

لیکن آپ کے یہاں جو یہ حوالہ آیا ہے وہ کس حوالے کے طور پر آیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

حوالے کے طور پر دیا ہے۔ جو آج کل کی حقیقت ہے وہ بیان کیا ہے۔ ہیں ہمارے یہاں ایسے صوفی ہیں لوگ ہیں، گاؤں میں ہیں قصبوں میں ہیں شہروں میں بھی جہاں پر خانقاہیں ہیں لوگ جاتے ہیں، رہتے ہیں وہاں۔

جمیل اختر:

صوفیوں کا جو سلسلہ ہے، جو عقیدہ ہے، آپ کا اس پر کچھ یقین ہے کیا؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں میرا یقین ہے، بہت اچھا کام کر رہے ہیں یہ لوگ۔ وہاں پر ہندو مسلمان سبھی جمع ہوتے ہیں، وہاں کوئی سیاست نہیں ہوتی ہے، وہاں پر بڑی اچھی باتیں ہوتی ہیں۔ بہت اچھا ہے، اچھی دو تین جگہیں ایسی ہیں جہاں پر لوگ جاتے ہیں اور جانے چاہئیں ورنہ یہ جو پورا ٹریڈیشن ہے وہ ختم ہو جائے گی، صوفیا کی۔

جمیل اختر:

کیا ذاتی طور پر آپ کبھی کسی ایسے بزرگ سے ملی ہیں؟ کسی ایسی خانقاہ میں گئی ہیں، جہاں آپ کو ذہنی سکون ملا ہو۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں ہاں گئی ہوں۔ بہت ملی ہوں، بہت بار گئی ہوں۔ ہمارے اپنے خاندان میں یہ روایت ہے بھئی۔ ہمارے اپنے خاندان میں صوفیا موجود ہیں۔ بزرگ موجود ہیں۔ خانقاہیں ہیں، ہماری اپنی بہت سی جگہیں ہیں، بہت سے ہمارے قصبات ہیں جہاں ہم جاتے ہی رہتے ہیں، وہاں پر ماحول بالکل مختلف ہے، وہاں پر اللہ رسول کی باتیں ہوتی ہیں، کوئی فتنے فساد کی باتیں نہیں ہوتی ہیں، ہندو بھی آتے ہیں۔ یہ تو ایک بہت بڑی پرمپرا ہے، اگر اس کو زندہ نہیں رکھا

گیا تو یہ ختم ہو جائے گی اور یہ ہمارے قصبات میں موجود ہے۔ لیکن انڈسٹریل شہروں میں ختم ہو چکی ہے۔

جمیل اختر:

نہیں پھر بھی دلّی اور اجمیر جیسے شہروں میں بھی ہے۔ دلّی تو بادن خواجاؤں کی چوکھٹ ہی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

دلّی وغیرہ تو خیر...... یہ تو دنیا کی بڑی مشہور جگہیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبات میں لوگ جاتے ہی رہتے ہیں، بڑا اچھا لگتا ہے اور یہ صوفیا جو ہیں سماج کے لیے اور عوام کے لیے سائیکٹرک کا کام کرتے ہیں، عوام کے لیے یہ لوگ روحانی ڈاکٹر ہیں۔ بڑا کام کرتے ہیں۔

جمیل اختر:

سماجی اصلاح کے لیے اس طرح کے اداروں کا رہنا کیا آپ کے خیال میں مفید ہے، آج کے دور میں؟

قرۃ العین حیدر:

اب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ سماجی اصلاح کے لیے ہے یا نہیں۔ لیکن بہرحال INDIVIDUAL جو ہیں وہ جاتے ہیں وہاں پر اور ان کو سکون ملتا ہے، ہندو جاتے ہیں، مسلمان جاتے ہیں۔ جو ہندو باہر جا کر لڑتا ہے مسلمان سے اور مسلمان ہندو سے وہاں جا کر وہ بیٹھتے ہیں ان کے سامنے، یہ قومی......

جمیل اختر:

یک جہتی کا گویا

قرۃ العین حیدر:

یک جہتی تو خیر بڑا گھسا پٹا لفظ ہے لیکن یہ جو TRADITION ہے صوفیا کی اس کو ختم نہیں

ہونا چاہیے۔

جمیل اختر:

صوفی صاحب کے حوالے سے ایک خیال یہ بھی ابھرتا ہے کہ آپ نے اسلام کے احیایا نشاۃ ثانیہ کی اس عالمی لہر یا تحریک کو جو ساری دنیا میں آج برپا ہے، مسلمانوں کی روحانی یا مذہبی تحریکات کے حوالے سے ان مراکز میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی بے یقینی صورتحال اور تشدد پسندی اور بدامنی نے اس کی تلاش میں مذہب کی طرف جھکاؤ کو رجحان ہی تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ تحریک کی شکل دے دی ہے؟ اور اسلام اس میں نمایاں اور اہم رول پلے کر رہا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی اسلام جو ہے ایک بڑا رول کر رہا ہے۔ ایک تو اسلام جو ہے بہت پولیٹکل چیز ہے وہ ایک عالم گیر پولیٹکس ہے اور ایک اسلام جو ہے وہ یہ ہے صوفیا کا اسلام جو چھوٹے چھوٹے قصبات میں بیٹھے ہوئے ہیں لوگ۔ دو طرح کا اسلام ہے۔ پولیٹکل اسلام میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، مجھے اس اسلام میں دلچسپی ہے جس میں ان تعلیمات کا تذکرہ ہوتا ہے جو ہمارے صوفیا نے دی ہیں۔ جو ان کی روایت ہیں۔

جمیل اختر:

''چاندنی بیگم'' میں آپ نے عصری تاریخ اور عصری مسائل کو تاریخی تناظر میں عہد قدیم سے عہد جدید تک ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا تاریخی تسلسل کے بیان کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا؟ جب نظام بدلتا ہے تو قدریں بھی بدلتی ہیں۔ جبلتیں باقی رہتی ہیں۔ قدروں اور جبلتوں کے فرق کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو سماجی نظام کے بدلنے کے بعد جو تسلسل بہ ظاہر نظر آتا ہے وہ تسلسل نہیں ہے کیونکہ انقلابی تبدیلیاں قدروں میں آجاتی ہیں۔ لیکن آپ اس تبدیلی کو بہت ہموار طریقے سے دکھاتی ہیں جبکہ میری ناقص رائے میں حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اس پر کچھ روشنی ڈالیں آپ۔

قرۃ العین حیدر:

تو غلط ہم کرتے ہوں گے۔ جو ہماری سمجھ میں آیا ہم نے ویسا کر دیا۔

جمیل اختر:

اس پر مزید کچھ روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

کیا مزید روشنی ڈالوں۔

جمیل اختر:

جواب کچھ تفصیل سے نہیں آ رہا ہے۔ اتنے بڑے سوال کا اتنا چھوٹا جواب۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی تو کیا جواب دوں میں۔ تسلسل کیا چاہتے ہیں آپ؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔

جمیل اختر:

چلیے چھوڑیے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں۔ بتلایئے نا آپ جو کہہ رہے ہیں تو بتلاؤں۔ کیا...... کیا؟

جمیل اختر:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب نظام بدلتا ہے تو قدریں بدلتی ہیں، جبلتیں باقی رہتی ہیں، قدروں اور جبلتوں کے فرق کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو سماجی نظام کے بدلنے کے بعد جو تسلسل بظاہر نظر آتا ہے وہ تسلسل نہیں ہے۔ کیونکہ انقلابی تبدیلیاں قدروں میں تو آجاتی ہیں۔ لیکن آپ اس تبدیلی کو بہت ہموار طریقے سے دکھلاتی ہیں جبکہ میری ناقص رائے میں حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہو سکتا ہے غیر ہموار ہوتی ہوں۔ میرے خیال میں ہموار ہوتی ہیں، ہموار بھی ہوتی ہوں گی، غیر ہموار بھی ہوتی ہیں۔ دونوں ہوتی ہیں۔

جمیل اختر:

آپ کے بیشتر ناول دستاویزی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمرانی مطالعہ بھی پیش کرتے ہیں، ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان ناولوں میں سماج کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس پر زبردست تبصرہ بھی ملتا ہے۔ کیا آپ اسے اپنے فن کا نمایاں پہلو سمجھتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے پتہ نہیں بھئی! فن کا نمایاں پہلو ہے یا نہیں.......... میں نے آپ سے پچیس دفعہ کہا کہ میں بس لکھ دیتی ہوں، جیسا سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتی ہوں۔ میں اس پر غور نہیں کرتی کہ اس کا فلسفیانہ پہلو کیا ہے؟ نفسیاتی پہلو کیا ہے، معاشی پہلو کیا ہے، سماجی پہلو کیا ہے اور تاریخی پہلو کیا ہے، یہ سب چیزیں میں نہیں کرتی کوئی رائٹر نہیں کرتا۔ کریٹو پروسس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ کریٹو پروسس میں جب آپ خود جائیں گے تب آپ کو اندازہ ہوگا، ابھی تو آپ صرف باہر سے دیکھتے ہیں۔ بڑا مشکل ہے یہ کہنا۔

جمیل اختر:

چاندنی بیگم کو آپ نے اپنا سب سے بہتر ناول بتلایا ہے جبکہ ناقدین نے اسے آپ کی ناکام تخلیق قرار دیا ہے۔ دونوں کے بیچ زبردست تضاد ہے۔ آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

جی نہیں.......... بالکل نہیں.......... ان کی مرضی ہے وہ ناکام کہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں ناکام نہیں ہے کامیاب ہے، اب یہ ان کی مرضی ہے کہ اس کو ناکام کہیں۔

جمیل اختر:

فنی طور پر آپ اسے بھرپور اور کامیاب تخلیق مانتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! بالکل.......... بالکل.......... بالکل

جمیل اختر:

کچھ لوگوں نے آخر شب کے ہم سفر کو بعض جہت سے آگ کا دریا سے بہتر ناول قرار دیا ہے، کچھ لوگوں نے آگ کا دریا کے بعد گردش رنگ چمن کو آپ کا دوسرا بہتر ناول قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کچھ نہیں کہنا ہے وہ جو چاہیں کریں ان کی مرضی ہے وہ جو سمجھیں، جس کو چاہیں بہتر کریں بدتر کریں، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں نے بس لکھ دیا ہے۔

جمیل اختر:

آپ کے بارے میں عام خیال لوگوں کا یہ ہے کہ آپ مذہب مخالف رجحان کی حامل ہیں اور آپ نے مذہب کا مذاق اڑایا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کے فکشن میں جا بجا اسلامی و اخلاقی اقدار ور جحان کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آپ کوئی باضابطہ مبلغ ہوں جو سچائی، ایمانداری اور خوف خدا کی تلقین کرتی نظر آتی ہیں جیسے انسانوں میں خوف و دہشت نہ پھیلاؤ خدا اس کی سزا دے گا دینے والا خدا ہے بندہ یہ نہ سمجھے کہ وہ خود کچھ حاصل کر سکتا ہے۔انسان کو ہر حالت میں ہر موقع پر سچ بولنا چاہیے۔اللہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جس کو چاہے ذلت دے، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے، عذاب قبر سے ڈرو، خود آپ اپنی ذاتی زندگی میں تصوف اور خانقاہی سلسلے سے وابستہ ہیں۔ہم یہ بات سمجھنا چاہیں گے کہ آپ کا نظریہ کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ کہاں لکھا ہے کہ میں نے مذہب کا مذاق اڑایا ہے۔

جمیل اختر:

آپ کی تحریروں کو پڑھ کر یہ عام خیال لوگوں کا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

کہاں ہے..........وہ کون سی تحریر ہے جس کو پڑھ کے لوگوں نے کہا کہ میں مذہب

مخالف ہوں، جن لوگوں نے میری تحریروں کو پڑھ کر یہ کہا کہ میں مذہب مخالف ہوں وہ کون بے وقوف لوگ ہیں؟

جمیل اختر:

اسی سماج کے لوگ ہیں۔ ناقدین ادب ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

تو مرضی ان کی! وہ جو چاہیں کہیں۔

جمیل اختر:

کیا آپ مذہب مخالف نہیں ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

(بگڑتے ہوئے) بھئی آپ بڑے IRRITATING سوالات کر رہے ہیں..........
آپ مذہب مخالف نہیں ہیں۔ ارے ساری باتیں ہو گئیں۔ سیتا کون تھی، رام کون تھا۔ یہ بڑے عجیب سوالات آپ کر رہے ہیں۔ بے وقوفی میں کبھی برداشت نہیں کرتی۔

جمیل اختر:

خیر چھوڑیئے۔ جواب مت دیجئے۔ میں آپ کو IRRITATE کرنا نہیں چاہتا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں۔ مذہب مخالف کیسے کہا آپ نے مجھ کو۔

جمیل اختر:

میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ جن سوالوں کا جواب نہیں دینا چاہیں مت دیں۔ لیکن جو باتیں آپ کے تعلق سے گشت کر رہی ہیں ان پر تو گفتگو ہوگی ہی۔ اس پر آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ چلیے آگے چلیے۔

جمیل اختر:

آپ کے کردار خدا کے بنائے ہوئے قانون سزا و جزا پر نہ صرف سوالیہ نشان کھڑا کرتے ہیں بلکہ اس کو رد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جیسا کہ ''یادوں کی ایک دھنک جلے'' میں ناصر چچا کی زبان سے ادا کی گئی صورت حال اور ''گردش رنگ چمن'' میں مہرو کے حالات، جس کے لیے وہ اپنے کو نہیں بلکہ خدا کو ذمہ دار سمجھتی ہے، تصور اسلامی پر طنز کرتی ہے اور خدا سے باغی ہو گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

سب سے بڑی غلطی جو کرتے ہیں آپ ناقد لوگ کہ کرداروں کے خیالات کو کرداروں کے الفاظ کو آپ اوتھر کے الفاظ سمجھتے ہیں۔ یہ کیوں کرتے ہیں؟ یہ بہت بڑی جہالت ہے۔ پچھلا سوالی جملہ جو آپ نے کوڈ کیا یہ جو آپ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، یہ خود آپ سوچئے کہ کردار ایک بات کر رہا ہے اسے آپ نے آتھر کا کیسے سمجھ لیا۔

جمیل اختر:

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جو اظہار خیال اوتھر کرتا ہے اپنے کسی کردار کے بارے میں تو اسے عام طور پر اوتھر کے خیال سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، یہ غلط ہے۔ جب آپ میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ صحیح طور پر پرکھ سکیں تو پھر تنقید کرنے کا حق آپ کو کس نے دیا؟ ناقد کی سہل پسندی اور غلط رویے نے ادب کی پرکھ کے سلسلے میں لوگوں کے اندر گمرہی پیدا کی ہے اور میں اس کو صحیح نہیں سمجھتی۔ جب تک چیزوں کو صحیح طور پر سمجھ اور پرکھ نہ لیا جائے عجلت میں کچھ بھی لکھنا تنقیدی اصولوں کے خلاف ہے اور اس سے قاری گمراہ ہوتا ہے اور خود ناقد کی جہالت بھی سامنے آتی ہے۔ جب آپ کے اندر ادب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جب آپ اپنے آپ کو فکشن سمجھنے کے لائق نہیں سمجھتے اور آتھر کو نہیں سمجھ سکتے تو آپ ادب مت پڑھیے اور لکھیے بھی نہیں۔ یہ تو بڑی مبتدیانہ باتیں ہیں جو آپ کر رہے ہیں۔ چلئے دوسرا سوال پوچھیے۔

جمیل اختر:

آپ کے فکشن میں تشخص کی تلاش کا مسئلہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ہر کردار اپنی ذات کی شناخت کے عمل میں مصروف ہے اور وہ اپنی شناخت اپنے خاندان، اپنے آبائی ورثہ، اپنے معاشرتی درجہ، اپنے ماضی اپنے معاشرے کے اخلاقی اور تہذیبی معیار، اپنے نظریہ حیات، اپنے مذہب، اپنی جنس غرض کہ مختلف حوالوں سے کرنا چاہتا ہے اور اپنے وجود سے آگاہی کی جستجو انھیں مسلسل بے چین اور مضطرب رکھتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آپ کا بنیادی مقصد تشخص کی تلاش ہے، آپ کے یہاں یہ عمل انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ملتا ہے اور آپ نے وقت اور تاریخ کے دھارے میں انسان کی حیثیت اور مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے، آپ اس پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

تشخص کی تلاش کا مسئلہ ہے، آپ نے صحیح سمجھا ہے اور آپ خود ہی بتا بھی رہے ہیں، بقراطی کر رہے ہیں تو میں کیا بتاؤں؟

جمیل اختر:

آپ کا اصل موضوع مسلم معاشرت کا انحطاط رہا ہے اور آپ نے اپنے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہزاروں سال پیچھے جا کر ماضی کی تاریخ و تہذیب کو کھنگالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ آپ ابھی تک اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر پائی ہیں۔ کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

کون سا سوال؟ اگر ہے تو ہوگا...... ہوگا ضرور، بتایئے وہ کون سا سوال ہے...... یہ جو آپ لوگ بقراطی کرتے ہیں کہ تلاش نہیں کر پائی ہوں، ہوسکتا ہے نہیں کر پائی ہوں۔ اگر آپ کی سمجھ میں یہی آتا ہے تو ہوگا ضرور...... دیکھیے یہ جو رائٹر لکھتا ہے تو اس کے ذہن میں جو باتیں نہیں ہوتی ہیں وہ آپ لوگ کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔

جمیل اختر:

ہاں اس کی مختلف تعبیریں اور تاویلیں ہوتی ہیں۔ جو بعض وقت رائٹر کے ذہن میں بھی نہیں ہوتا۔

قرۃ العین حیدر:

یہی تو...... اس کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں، اتنا منطق کرتے ہیں کہ جو بات نہیں بھی ہوتی ہے وہ نکال لیتے ہیں اور اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔

جمیل اختر:

آپ نے اپنے ہر ناول میں تاریخ کی ایک پرت ضرور اتاری ہے۔ یہاں تک کہ گردشِ رنگ چمن میں آپ طوائف کی طرف راغب ہوئی ہیں تا کہ مسلمانوں کے انحطاط کا سبب معلوم کر سکیں لیکن معاملہ یہاں بھی غیر اطمینان بخش محسوس ہوتا ہے، ایسا کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے انحطاط ہے تو انحطاط ہے اس کا جواب کیا ملے گا۔ دیکھیے آپ لوگ چاہتے ہیں کہ ایک کلاس روم ہے جس میں ہر ایک سوال کا جواب بلیک بورڈ پر لکھ دیا جائے۔ یہ ایسا نہیں ہوتا ہے...... ایسا نہیں ہوتا ہے بھئی!

جمیل اختر:

آپ کے یہاں غیر مسلم کردار کسی حد تک تو مطمئن ہیں لیکن مسلم کردار غیر مطمئن ہیں اس کی وجہ؟

قرۃ العین حیدر:

یہ کیا بات ہوئی! یہ تو آپ بالکل پاکستانیوں والا سوال کر رہے ہیں۔ ایک پاکستانی نے کہا تھا کہ انڈیا کے مسلمانوں کی آنکھوں میں روشنی نظر نہیں آتی ہے۔ کیا غیر مطمئن ہیں...... اور کون مطمئن ہیں، یہ آپ بڑی غلط قسم کی تاویل نکال رہے ہیں۔

جمیل اختر:

نہیں! اس سے ہندو مسلم کے رجحان کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ کرداروں کی نجی زندگی میں

اطمینان اور عدم اطمینان کا معاملہ ہے دو فرقوں کے بیچ!

قرۃ العین حیدر:

وہ کون سے کردار ہیں؟ نام بتائیے نا۔

جمیل اختر:

بہت سے کردار ہیں جیسے آگ کا دریا کے گوتم نیلمبر ہی کو لے لیں۔ یہ کردار بہت آسودہ اور مطمئن ہے۔ دوسری طرف کمال الدین احمد اور چمپا احمد کو لے لیں، ان کے یہاں نہ آسودگی ہے نہ اطمینان زندگی غیر اطمینان بخش ہے۔ میں دراصل اس فرق کی بات کر رہا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

گوتم نیلمبر تو شروع سے ہے.......... بھئی! جب معاشرہ ہی انحطاط پذیر ہے تو آسودگی اور اطمینان اس طبقے کے کرداروں میں آئے گا کہاں سے؟ ویسے میں نے اس چیز کو محسوس نہیں کیا۔ میں سو بار کہہ چکی ہوں کہ میں جیسا سمجھتی ہوں محسوس کرتی ہوں لکھ دیتی ہیں۔ اس کو تجزیہ کر کے دیکھتی نہیں۔ یہ تو آپ ناقد لوگ تجزیہ کر کے بال کی کھال نکالتے ہیں۔

جمیل اختر:

چونکہ آپ کا ترقی پسند تحریک سے براہ راست تعلق نہیں تھا۔ اس لیے ترقی پسند ناقدوں نے آپ کو قابل التفات نہیں سمجھا۔ حتیٰ کہ اس تحریک کے زیر اثر فکشن پر جو تنقید لکھی گئی اس میں بھی آپ کا ذکر یا تو برائے نام ہے یا منفی انداز اپنایا گیا ہے، جبکہ ادب میں آپ کے مقام و مرتبے پر اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ سب غیر ترقی پسندوں نے لکھا ہے۔ آخر اس ناانصافی کی وجہ کیا ہے؟ یہ ادبی دیانت داری کے خلاف نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ یہ آپ کو تو معلوم ہے تو میں کیا بتاؤں؟ یہ آپ گڑے مردے اکھاڑ رہے ہیں، ترقی پسندوں نے یہ کیا وہ کیا؟ یہ لوگ اب بھول بھی گئے کہ ترقی پسندوں نے کیا کیا؟ کون، کس نے کیا لکھا، بے کار کی بات ہے سب۔ یہ آپ

گڑے مردے کیوں اکھاڑ رہے ہیں؟

جمیل اختر:

اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتیں؟

قرۃ العین حیدر:

کہنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے تو کیا کہوں؟

جمیل اختر:

یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ آپ اتنی بڑی ادیبہ ہیں۔ آپ نے ادب میں نئے تجربات کیے، اردو فکشن کو نئی راہ دکھائی اور ترقی پسندوں کے جید علما کا آپ کے گھر میں آنا جانا تھا۔ خود آپ کے ہم عصر ناقدوں میں کئی نقاد اور ترقی پسند ناقد آپ کے حلقہ احباب میں شامل رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود کسی نے بھی اپنے قلم کو زحمت نہیں دی، حتیٰ کہ علی سردار جعفری نے بھی آپ کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہا نہ لکھا۔ سجاد ظہیر کی بات تو بہت دور رہی۔ آخر اس کی وجہ اور سبب کیا ہے؟ ادبی تاریخ کے حوالے کے لیے اس پر روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں لکھا۔ وہ تو خلاف تھے نا۔ تو اس سے کیا فرق پڑ گیا۔ ترقی پسندوں کی جو پوری صف تھی میں اس میں شامل نہیں تھی، بس ہو گئی بات ختم۔ تو اس سے کیا فرق پڑ گیا مجھ پر۔

جمیل اختر:

ترقی پسندوں نے تو آپ کی فیوڈلزم کی وجہ سے آپ کے فن کی قدر نہ کی لیکن جدیدیت والوں کو آپ سے کیا ناراضگی تھی جو بانی جدیدیت سے لے کر معتقدین جدیدیت تک کسی نے بھی آپ پر توجہ نہیں کی اور آپ کے فکشن کے بہت سے تجربے جو جدیدیوں سے میل کھاتے ہیں ان پر اظہار خیال نہیں کیا۔

قرۃ العین حیدر:

یہ ان کی مرضی...... یہ ان کی مرضی...... انھوں نے انور سجاد کو اردو میں نئے افسانے کا

معمارِ اعظم قرار دیا جبکہ نیا افسانہ سب سے پہلے میں نے لکھا ہے، یہ جو یہ لوگ آج لکھ رہے ہیں یہ میں نے اپنے لڑکپن میں لکھا تھا۔

جمیل اختر:

اسی حوالے سے یہ سوال بھی ہے کہ آپ کے بہت سے تجربے جوان لوگوں سے میل کھاتے ہیں، آپ نے سب سے پہلے کیے۔

قرۃ العین حیدر:

بہت پہلے کیے، ان کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کرتا..........اس لیے تذکرہ نہیں کرتے کہ دھاندھلی اور کیا وجہ ہوگی..... پتہ نہیں۔

جمیل اختر:

کبھی آپ کی ان لوگوں سے بالمشافہ کوئی گفتگو ہوئی؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں..........میں نے اس کی کبھی پرواہ ہی نہیں کی۔

جمیل اختر:

مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی ہی ہیں انھوں نے کبھی آپ پر کوئی مضمون نہیں لکھا۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! نہیں لکھا۔ کبھی پرواہ نہیں کی میں نے، ان لوگوں کا پورا ایک گروپ ہے جس میں ان لوگوں نے کچھ لوگوں کو بالکل اگنور کیا ہے اور کچھ لوگوں کو بڑھا چڑھا کر کے پیش کیا۔ مگر وہ لوگ چلے نہیں۔ یہ جو جدید یے ہیں ان لوگوں کا کوئی ایک رائٹر بھی سروائیو نہیں کیا۔ سوائے چند ایک کے جن کے یہاں تھوڑی سی جھلک پرانے بیانیے کی تھی۔ ورنہ ایک زمانہ وہ تھا کہ چھت سے اڑی چھپکلی، بندر کی چونچ میں سرغا اور مرغے کی چونچ میں سورج اس قسم کی مہمل چیزیں ایک زمانے میں بہت آ رہی تھی۔ اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم بہت بڑا کمال کر رہے ہیں تو انھوں نے اصل میں مینڈکوں کی پوری بارات نکالی، مینڈکوں کی زبان میں۔ تو یہ کہاں چلا۔ چلا.....؟

جمیل اختر:

نہیں چلا......لیکن آپ پر نہیں لکھنے کی وجہ کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ جو پورا گروپ ہے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بہت تعریفیں کی جائیں کہ آپ بڑے کمال کی چیز ہیں۔ ان کی خوشامد کی جائے درد پردہ یہ کہ ہمارے بارے میں مضمون لکھ دیجیے۔ وہ میں نے کبھی کیا نہیں۔ میں نے ان کا نوٹس نہیں لیا۔ عادت پڑ گئی ہے نقادوں کو ادب میں حکمرانی کرنے کی۔ نقاد بہت امپورٹنٹ ہو گیا ہے۔

جمیل اختر:

ان دنوں مابعد جدیدیت کی بحث چھڑی ہوئی ہے اور اسے ادبی تنقید کی نئی تھیوری کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، آپ اس تھیوری پر کچھ اظہار خیال کرنا چاہیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

بالکل نہیں۔ مابعد جدیدیت کیا ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاس اس طرح کی فالتو باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔

جمیل اختر:

شوکت صدیقی نے ایک ملاقات میں مجھ سے یہ بات کہی کہ "آخر شب کے ہم سفر" میں آپ نے تاریخی حقائق کو توڑ موڑ کر بیان کیا ہے اور یہ کہ آپ کا تاریخ کا ادراک صحیح نہیں ہے، اس کی ایک وجہ انھوں نے یہ بتلائی کہ آپ نے کیمونسٹ پارٹی کو انڈر گراؤنڈ ورک کرتے ہوئے دکھلایا ہے جبکہ ان کا کہنا ہے کہ کیمونسٹ پارٹی پر جو پابندی تھی وہ ایسی نہیں تھی کہ انڈر گراؤنڈ ورک کیا جائے، کیمونسٹ پارٹی تو کانگریس ہی کا ایک حصہ تھی اور جون 1942 عیسوی میں کیمونسٹ پارٹی سے پابندی ختم کردی گئی جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا۔

دوسری چیز انھوں نے یہ بتلائی کہ آپ نے ریحان الدین کو داڑھی بڑھائے ہوئے انڈر گراؤنڈ دکھلایا ہے اور وہ دھوکے سے سندر بن کے جنگلوں میں لڑکیوں کو بلاتا ہے اور رنگ

رلیاں مناتا ہے، تو کیمونسٹ پارٹی کبھی ایسی نہیں تھی۔ پھر آپ نے حقائق کو مسخ کر کے کیوں پیش کیا؟

قرۃ العین حیدر:

شوکت صدیقی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہیں۔ ریحان الدین نے کوئی رنگ رلیاں نہیں منائی۔ لڑکیوں کو بلا کے رنگ رلیاں منایا ہے۔ یہ کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟

جمیل اختر:

سندر بن کے جنگلوں میں انڈر گراؤنڈ ورک کرتے ہوئے تو دکھلایا ہے آپ نے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! انڈر گراؤنڈ ورک کرتے تھے، انڈر گراؤنڈ ورک ہوتا تھا، انڈر گراؤنڈ ورک کیا ہے تو انڈر گراؤنڈ ورک کرتے ہوئے دکھلایا ہے۔

جمیل اختر:

لیکن ان کا کہنا ہے پابندی کوئی ایسی نہیں تھی کہ انڈر گراؤنڈ ورک کیا جاتا۔

قرۃ العین حیدر:

یہ ان کا خیال ہے، لیکن مجھے پتہ ہے نا کہ انڈر گراؤنڈ ورک ہوتا تھا، سجاد ظہیر انڈر گراؤنڈ ورک کرتے تھے۔ داڑھی بڑھا کے اور یہ کہنا کہ لڑکیاں بلوا کے۔ یہ کیا بکواس ہے...... یہ کیا بکواس ہے...... یہ کیا بکواس ہے؟

جمیل اختر:

ایک اچھے تخلیق کار کے اندر تنقید کو برداشت کرنے کا وافر مادہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تنقید ہی تخلیق کے جوہر کو اجاگر کر کے کندن بناتی ہے اور اسے قدر و منزلت عطا کرتی ہے، لیکن آپ کے بارے میں کہا یہ جاتا ہے کہ آپ تنقید تھوڑا بہت بھی برداشت نہیں کرتیں۔ یعنی دس چیزیں آپ کی تعریف میں کہی جائیں اور ایک بھی آپ کی طبیعت کے خلاف ہو تو آپ خفا ہو جاتی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ بالکل غلط ہے۔ دیکھیے میرے خلاف اتنے مضمون لکھے گئے ہیں اینٹی کہ اگر ان کو جمع کر دیا جائے تو ان کی پوری ایک کتاب بن سکتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ یہ جو کہہ رہے ہیں کہ آپ خفا ہو جاتی ہیں، یہ بالکل بکواس ہے، غلط ہے۔ کہاں خفا ہوتی کس پر خفا ہوتی، کس کو میں نے جھاڑا، کیا لکھا میں نے، کیوں ایسی باتیں لوگ کرتے ہیں غیر ذمہ داری کی۔ اس پر مجھے غصہ آتا ہے۔

جمیل اختر:

آپ کا غصہ بجا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اس لیے میں نہ زیادہ ملتی ہوں، نہ رائٹرز سے اور نہ انٹرویو دیتی ہوں، اس لیے کہ میں نے بہت بھگت لیا۔

جمیل اختر:

ورجینا وولف جدیدیت کی موجد تھی؟ آپ پر ان کا کیا اثر ہوا۔ اس لیے کہ آپ دونوں کے اسلوب میں مماثلت بہت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ورجینا وولف جدیدیت کی موجد ہوگی مجھے نہیں پتہ، جس زمانے میں میں نے لکھنا شروع کیا تھا ان کو نہیں پڑھا تھا بعد میں پڑھا ہے۔ ہوگا اثر مجھے پتہ نہیں۔

جمیل اختر:

تاریخی اصلاح کے لیے یہ سوال ہے کہ آپ ہندستان سے پاکستان کب گئیں اور کب واپس آئیں اور کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

اوہو......دیکھیے یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، کب گئی اور کب واپس آئی، اس طرح کے

سوالوں کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتی۔ کیوں واپس آئی، میری مرضی، جب جی چاہا چلی گئی جب جی چاہا چلی آئی۔

جمیل اختر:

آپ جاگیرداری، جمہوریت، سرمایہ داری ان تینوں نظام میں سے کس کو بہتر سمجھتی ہیں اور کیوں؟ میں یہ گذارش بھی کروں گا کہ جمہوریت کا جو تصور آپ کے ذہن میں ہے اسے واضح کریں، جبکہ جمہوریت ایک کلیشے ہو گیا ہے اور جمہوریت کے نام پر سارے ظلم اور جبر دیکھے اور اُن دیکھے ہو رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے صاحب یہ پولیٹکل سوال ہے۔ میں جمہوریت کی تھیوری پر بیٹھ کے لکچر دوں کیا۔ یہ بے کار کا سوال ہے۔ بالکل بچوں والا سوال ہے، جمہوریت دمہوریت یہ کیا سوال ہے۔

جمیل اختر:

آج پوری دنیا میں اسلامی احیا کی تحریک چل رہی ہے، امریکہ اور انگلینڈ میں بھی اس تحریک نے کافی زور پکڑ رکھا ہے اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہو رہے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا کہ یا تو بالشوزم اسلام پر چھائے گا یا اسلام بالشوزم پر، بالشوک حکومت تو روس میں ختم ہو گئی اگرچہ دنیا کے سب سے بڑے ملک چین میں کیمونزم ہے، کیا اگلی صدی اسلام کی صدی ہو گی؟ آپ کا خیال کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے ایک تو مبالغہ ہے، یہ مسلمانوں کی خوش فہمی ہے کہ جوق در جوق لوگ مسلمان ہو رہے ہیں، مغرب میں یہ غلط ہے، ایکا دوکا لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ جو ہو رہے ہیں وہ ہندو ہو رہے ہیں یا پھر بدھسٹ ہو رہے ہیں۔ مسلمان بہت کم ہو رہے ہیں، اس لیے کہ مسلمان ایک بڑا سخت گیر مذہب ہے، وہ اپنا پرانا مذہب چھوڑ کے ایک اور سخت گیر مذہب میں کیوں جائیں۔ ویدانت اور بدھسٹ یہ ان کو بڑے ATTRACTIVE لگتے ہیں لہٰذا زیادہ سے زیادہ لوگ جو ہیں خاص طور سے دانش ور وہ ویدانت کی طرف جا رہے ہیں۔ اسلام کی طرف جو

قرۃ العین حیدر:

یہ بالکل غلط ہے۔ دیکھیے میرے خلاف اتنے مضمون لکھے گئے ہیں اینٹی کہ اگر ان کو جمع کردیا جائے تو ان کی پوری ایک کتاب بن سکتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ یہ جو کہہ رہے ہیں کہ آپ خفا ہو جاتی ہیں، یہ بالکل بکواس ہے، غلط ہے۔ کہاں خفا ہوتی کس پر خفا ہوتی، کس کو میں نے جھاڑا، کیا لکھا میں نے، کیوں ایسی باتیں لوگ کرتے ہیں غیر ذمہ داری کی۔ اس پر مجھے غصہ آتا ہے۔

جمیل اختر:

آپ کا غصہ بجا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اس لیے میں نہ زیادہ ملتی ہوں، نہ رائٹرز سے اور نہ انٹرویو دیتی ہوں، اس لیے کہ میں نے بہت بھگت لیا۔

جمیل اختر:

ورجینا وولف جدیدیت کی موجد تھی؟ آپ پر ان کا کیا اثر ہوا۔ اس لیے کہ آپ دونوں کے اسلوب میں مماثلت بہت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ورجینا وولف جدیدیت کی موجد ہوگی مجھے نہیں پتہ، جس زمانے میں میں نے لکھنا شروع کیا تھا ان کو نہیں پڑھا تھا بعد میں پڑھا ہے۔ ہوگا اثر مجھے پتہ نہیں۔

جمیل اختر:

تاریخی اصلاح کے لیے یہ سوال ہے کہ آپ ہندستان سے پاکستان کب گئیں اور کب واپس آئیں اور کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

اوہو......دیکھیے یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، کب گئی اور کب واپس آئی، اس طرح کے

سوالوں کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتی۔ کیوں واپس آئی، میری مرضی، جب جی چاہا چلی گئی جب جی چاہا چلی آئی۔

جمیل اختر:

آپ جاگیرداری، جمہوریت، سرمایہ داری ان تینوں نظام میں سے کس کو بہتر سمجھتی ہیں اور کیوں؟ میں یہ گذارش بھی کروں گا کہ جمہوریت کا جو تصور آپ کے ذہن میں ہے اسے واضح کریں، جبکہ جمہوریت ایک کلیشے ہو گیا ہے اور جمہوریت کے نام پر سارے ظلم اور جبر دیکھے اور اُن دیکھے ہو رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے صاحب یہ پولیٹکل سوال ہے۔ میں جمہوریت کی تھیوری پر بیٹھ کے لکچر دوں کیا۔ یہ بے کار کا سوال ہے۔ بالکل بچوں والا سوال ہے، جمہوریت وہوریت یہ کیا سوال ہے۔

جمیل اختر:

آج پوری دنیا میں اسلامی احیا کی تحریک چل رہی ہے، امریکہ اور انگلینڈ میں بھی اس تحریک نے کافی زور پکڑ رکھا ہے اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہو رہے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا کہ یا تو بالشوزم اسلام پر چھائے گا یا اسلام بالشوزم پر، بالشوک حکومت تو روس میں ختم ہو گئی اگر چہ دنیا کے سب سے بڑے ملک چین میں کیونزم ہے، کیا اگلی صدی اسلام کی صدی ہوگی؟ آپ کا خیال کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے ایک تو مبالغہ ہے، یہ مسلمانوں کی خوش فہمی ہے کہ جوق در جوق لوگ مسلمان ہو رہے ہیں، مغرب میں یہ غلط ہے، ایکا دوکا لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ جو ہو رہے ہیں وہ ہندو ہو رہے ہیں یا پھر بدھشٹ ہو رہے ہیں۔ مسلمان بہت کم ہو رہے ہیں، اس لیے کہ مسلمان ایک بڑا سخت گیر مذہب ہے، وہ اپنا پرانا مذہب چھوڑ کے ایک اور سخت گیر مذہب میں کیوں جائیں۔ ویدانت اور بدھشٹ یہ ان کو بڑے ATTRACTIVE لگتے ہیں لہٰذا زیادہ سے زیادہ لوگ جو ہیں خاص طور سے دانش ور وہ ویدانت کی طرف جا رہے ہیں۔ اسلام کی طرف جو

جا رہے ہیں وہ دراصل احمدیت یعنی قادیانی مذہب کی طرف جا رہے ہیں۔ قادیانیوں کے مذہب میں اس لیے جا رہے ہیں کہ ان کا ایک بہت اچھا نیٹ ورک ہے، یہ خوش فہمی ہے جو یہ کہا جائے کہ جوق در جوق اہل مغرب مسلمان ہو رہے ہیں۔

جمیل اختر:

ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ مسلکی تشدد نے بھیانک صورت اختیار کر لی ہے۔ شیعہ سنی، دیوبندی بریلوی کے جھگڑے نے کراچی اور لکھنؤ میں فساد کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس اختلاف کی بنیادی وجہ آپ کے خیال میں کیا ہے۔ اس لیے کہ آپ کے یہاں دونوں مسلک کا ملا جلا ماحول رہا ہے۔ آپ کے والد ایک فرقے سے اور والدہ دوسرے فرقے سے تھیں۔ آپ نے کیا محسوس کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی یہ بھی ایک بالکل اختلافی سوال ہے۔ چھوڑیئے شیعہ سنی میں آ گئے۔ چھوڑیئے یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے کوئی نئی بات کیجیے جھگڑے ہو رہے ہیں، جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے سے یہ سب ہو رہا ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ مسلکی جھگڑے بالکل غلط چیز ہیں۔ لیکن کیا کوئی مانتا ہے۔ اس نام پر خون خرابہ عام بات ہو کر رہ گئی ہے۔ چلیے۔ چھوڑیئے اسے۔

جمیل اختر:

ہندستانی سیاست میں عورتوں کے لیے ریزرویشن کا بل پیش ہونے والا ہے جو سیاسی اختلاف کی وجہ سے التوا میں پڑا ہوا ہے کیا آپ ہندستانی سیاست میں عورت کے لیے ریزرویشن کی حامی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

پتہ نہیں، میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا ہے۔ یہ سیاسی قسم کا سوال ہے اس پر میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔

جمیل اختر:

چونکہ آپ نے اپنے فکشن میں عورتوں کے مسائل کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اس حوالے سے بھی یہ سوال آپ کے لیے اہم ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں۔ بہت لکھا ہے۔ لیکن اس سوال پر کبھی غور نہیں کیا۔

جمیل اختر:

اردو میں مختصر افسانے کا بانی پریم چند کو قرار دیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے والد سید سجاد حیدر یلدرم نے انگریزی اور ترکی زبانوں کے ترجمے کے ذریعے اس صنف کو اردو میں متعارف کرایا۔ اردو میں یلدرم سے پہلے مختصر افسانے کا کوئی نمونہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اور یہ واقعہ 95-1894 کا ہے اور پریم چند نے افسانہ نگاری 1907 سے شروع کی۔ ان ٹھوس شہادتوں کی موجودگی میں بھی اتنا بڑا تحقیقی فراڈ کیسے ہوا؟ کیا ترقی پسند تحریک سے پریم چند کی براہ راست وابستگی اس کا سبب تو نہیں؟

قرۃ العین حیدر:

یہ بھی CONTROVERTIAL سوال ہے۔ اس پر بھی کنٹروورسی ہے چھوڑیئے اس سوال کو بھی۔

جمیل اختر:

بہ حیثیت مصنفہ آپ کی والدہ نذر سجاد حیدر کو اردو ادب میں کوئی مقام کیوں نہیں ملا۔ جبکہ وہ خواتین فکشن نگاروں میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اب یہ آپ نقادوں سے پوچھئے۔ میں کیا جواب دوں؟

جمیل اختر:

آخر ان کو نظر انداز کرنے کی وجہ کیا ہے؟ آپ کا اپنا خیال کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں..... عورتوں کا جو ادب ہے اس میں ان کا بہت مقام ہے۔ بہت ان کو پڑھا جاتا ہے، اب بھی بڑی اہمیت ہے۔

جمیل اختر:

اردو فکشن کی جو تاریخ ہے اس میں ان کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں اردو فکشن میں وہ اس لیے کہ ہمارے یہاں جو وقار عظیم صاحب ٹائپ لوگ ہیں انھوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ عورتوں نے جو ادب تخلیق کیا ہے وہ دوسرے درجے کا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہاں بھیڑ چال ہوتی ہے۔ وقار عظیم نے کہہ دیا تو سب چل پڑے اس پر۔ کسی نے خود سے نہیں سوچا کہ ہم پڑھیں کہ عورتوں نے کیا لکھا ہے۔ عورتوں کا جو کنٹری بیوشن ہے فکشن میں اس کے بارے میں کسی نے بھی کچھ نہیں لکھا اور نہ پڑھا۔ وہ شروع کرتے ہیں تو عصمت چغتائی سے یا رشید جہاں سے اس سے پہلے حجاب امتیاز علی کو مذاق کے طور پر۔ مذاق اڑاتے ہیں ان کا۔ تو ہمارے یہاں جو فکشن کے بارے میں لکھا گیا ہے وہ جاہلانہ ہے۔

جمیل اختر:

آپ اپنے افسانوں کے بارے میں تفصیل سے بتلائیں گی کہ آپ نے افسانوں میں کون کون سے ٹرینڈ شروع کیے یا کس نئے رجحان کو متاثر کیا؟

قرۃ العین حیدر:

ارے چھوڑیے۔ جانے دیجیے، میں نہیں جانتی۔

جمیل اختر:

کچھ دو چار چیزیں۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! مجھے نہیں معلوم نہ اپنے بارے میں، سوچتی ہوں، نہ اپنے بارے میں پڑھتی

ہوں نہ اپنے بارے میں لکھتی ہوں۔

جمیل اختر:

آپا! یونیورسٹی کے طالب علموں کے لیے یہ سوال ہے۔ چونکہ آپ نصاب میں داخل ہو چکی ہیں اور آپ پر تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری ہے اس لیے اس سوال پر کچھ روشنی ضرور ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

کیسا؟

جمیل اختر:

یہی کہ آپ نے کون کون سے نئے ٹرینڈ شروع کیے جو آپ سے قبل نہیں تھے؟

قرۃ العین حیدر:

شعور کی رو، یہ بھیا میں نے خود شروع کیا اس وقت تک ورجینا وولف کو میں نے پڑھا نہیں تھا، ایک تو یہ شروع کیا میں نے اور جدید سوسائٹی میں جس طرح کی زندگی پائی جاتی تھی اور ان کے جو مسائل تھے اور جو انٹلکچوئل کیریکٹر یعنی ذہنی دانش ور کیریکٹر وہ میں نے پیش کیے۔

جمیل اختر:

فلیش بیک کی تکنیک کی بھی باضابطہ شروعات آپ نے کی ہے۔ آپ سے قبل یہ تکنیک فلموں میں استعمال ہوتی تھی لیکن اردو فکشن میں آپ نے متعارف کرایا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تو پھر یہ چیز لکھیے۔ لکھیے۔

جمیل اختر:

ہاں وہ تو میں نے لکھا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

کہاں پر ہے، فلیش بیک؟

جمیل اختر:

آپ کے افسانوں اور ناولوں دونوں ہی میں ہے۔لیکن آپ سے قبل یہ تکنیک اردو میں موجود نہیں تھی۔

قرۃ العین حیدر:

تو ٹھیک ہے۔لکھیے۔

جمیل اختر:

وہ تو میں نے لکھا ہے۔آپ کو یاد دلا رہا ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا۔میں نہیں جانتی۔میں اپنے بارے میں سوچتی نہیں ہوں تو بولنے اور یاد کرنے کا کیا سوال ہے؟

جمیل اختر:

اگر آپ اس طرح اپنے بارے میں بھولتی رہیں تو لوگ مزید بھول جائیں گے۔

(ہنستے ہنستے)

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں۔

جمیل اختر:

اس لیے اس پر کبھی کبھی مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

آپ کہتے ہیں تو غور کروں گی۔

جمیل اختر:

اردو میں فکشن کی تنقید نہیں کے برابر ہوئی ہے۔آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

تن آسانی، سہل پسندی۔

جمیل اختر:

ذرا اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

قرۃ العین حیدر:

کیا تفصیل سے روشنی ڈالوں؟ شاعری پڑھنا آسان ہے، غزل پڑھی، نظم پڑھی اور اس پر لکھ دیا۔ فکشن کے لیے آپ کو بہت پڑھنا پڑے گا۔ فکشن کے لیے آپ کو اس کی بیک گراؤنڈ بھی جاننی چاہیے اور وہ مغربی بیک گراؤنڈ ہے مشرقی تو ہے نہیں۔ تو پھر یہ سب کرنے کے لیے وقت چاہیے۔ وہ کون کرے گا یہاں؟ اس لیے ہمارے یہاں فکشن کی تنقید نہیں کے برابر لکھی گئی ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

جمیل اختر:

کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ نسوانی فکشن رائٹر کی ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے جو نہیں ہوئی ہے اب تک۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! ہونی چاہیے...... بالکل ہونی چاہیے، مغرب میں بھی نہیں ہوئی ہے...... یہاں بھی نہیں ہوئی ہے...... چائنا میں بھی نہیں ہوئی ہے جاپان میں بھی نہیں ہوئی ہے۔ فکشن تو دراصل عورتوں نے ہی لکھا ہے۔ ناول تو عورتوں نے ہی لکھے ہیں۔ جزئیات نگاری عورتوں نے ہی کی ہے۔ انسانی رشتوں کے بارے میں عورتوں نے ہی لکھا ہے۔

جمیل اختر:

تنقید کی طرف عورتیں مائل نہیں ہو رہی ہیں اس لیے اردو میں ناقد کی حیثیت سے بہت کم خواتین نظر آتی ہیں جبکہ تخلیقی فن کار کی حیثیت سے عورتیں بہت زیادہ ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اب اس کی کیا وجہ ہے مجھے معلوم نہیں۔ میرے خیال میں تن آسانی ہے اس کی وجہ جو عورتیں نہیں کر پاتی ہیں۔

جمیل اختر:

تاریخ، تاریخیت اور تاریخی حسیت میں آپ کے خیال میں کیا فرق ہے؟ آپ کا تصور کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

تاریخ ہسٹری ہے۔ تاریخیت HISTORICITY ہے اور تاریخی حسیت SENSE OF HISTORY ہے۔ اب میں اس میں فرق کیا بتلاؤں؟

جمیل اختر:

طالب علموں کے لیے یہ سوال چونکہ بے حد اہم ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

اب میں تفصیل سے کیا روشنی ڈالوں؟ ان میں جو فرق ہے وہ ہے۔

جمیل اختر:

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اوریجنل ٹیلنٹ کی خاتون ہیں۔ آپ کے اسلوب میں جو شگفتگی و شادابی، وسعت و تنوع اور اس میں جو ایک سیمابیت ہے وہ تقلیدی اسلوب میں ہو ہی نہیں سکتی بلکہ یہ تخلیقی اسلوب کی ہی خوبی ہے۔ پھر آپ پر مغربی ادیبوں کی نقالی کا الزام کیوں لگایا جاتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ تو آپ ان لوگوں سے پوچھیے جو اس طرح کا الزام لگاتے ہیں۔ پوچھیے...... پوچھیے۔ اس سلسلے میں اور کیا کہوں؟

جمیل اختر:

میری تحقیق کے مطابق آپ کے تیس پینتیس افسانے ایسے ہیں جو آپ کے چاروں افسانوی مجموعوں میں سے کسی میں بھی شامل نہیں ہیں اور نہ پاکستان کے جعلی اڈیشنوں میں بھی، کیا آپ نے انھیں قصداً نہیں دیا یا تلاش بسیار کے بعد آپ کے ہاتھ نہ آنے سے یہ پردہ خفا میں ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی! مجھے پتہ ہی نہیں چلا، نہ میں نے تلاش کیا، ارے چھپے ہوں گے تو مجھے معلوم ہی نہیں آپ ذرا مہربانی کر کے اس کی فوٹو کاپی مجھے بنوا دیجیے تو اس کا ایک کلیکشن چھاپ دیں گے۔

جمیل اختر:

اسی سے ملتا جلتا ہوا یہ سوال ہے۔ کیا آپ اپنے ان افسانوں کو جو میری تحقیق ہیں مرتب کر کے شایع کرنے کی اجازت دیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

بالکل دوں گی۔

جمیل اختر:

کیا میں اس کو مرتب کر کے شایع کروں؟

قرۃ العین حیدر:

ضرور شایع کریں۔ لیکن ایک بار مجھے دکھا ضرور لیں۔

جمیل اختر:

آپ کو دکھائے بغیر یہ شایع نہیں ہوں گے۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا۔ ٹھیک ہے۔

جمیل اختر:

کیا ہندستان میں اردو کی موجودہ صورت حال سے آپ مطمئن ہیں؟ یا مستقبل میں اس کے مزید بہتر ہونے کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بس بس بس، یہ سیاست ہے۔ یہ سیاسی سوال ہے۔

جمیل اختر:

آپا یہ سیاست نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں نہیں کروں گی اس پر بات۔ اردو کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔ ارے بھئی چھوڑیے بھی اس کو۔

جمیل اختر:

آپ اپنے افسانہ ''تلاش'' کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی وہ افسانہ جو تھا وہ ہم گئے تھے ایک آیا کی تلاش میں کلکتے میں۔ ہم گئے ہوئے تھے اپنی دوست کے یہاں تو ہم گاڑی پر بیٹھ کر نکلے آیا کی تلاش میں تو ہم پہنچ گئے ایک جگہ سونا گاچھی، سونا گاچھی وہاں کا بہت بدنام علاقہ ہے طوائفوں کا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو گلی میں، جا کر گاڑی کا انجن فیل ہو گیا۔ اب ہم لوگ بہت پریشان اگر کسی جرنلسٹ نے دیکھ لیا کہ ہم لوگ یہاں پر ہیں تو اخبار میں نکل آئے گا۔ تو وہاں دہلیز پر ایک لڑکی بیٹھی سرخ رنگ کی ساڑی پہنے سفید رنگ اس کا بہت پیاری شکل اس کی، وہ ہم لوگوں کو دیکھ کے بار بار نہایت ادب سے نمسکار کر رہی تھی۔ وہ لڑکی مجھے کبھی نہیں بھولی کہ کہاں سے آئی تھی کہاں بیٹھی تھی۔ یاد نہیں، تو اس پر یہ افسانہ تلاش لکھا تھا۔

جمیل اختر:

''فن کار'' جو آپ کا افسانہ ہے اس کے بارے میں کچھ بتلائیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے یاد نہیں ہے کچھ بھی؟

جمیل اختر:

اچھا ایک افسانہ ہے" تار پر چلنے والی"

قرۃ العین حیدر:

ہاں وہ بھی صحیح ہے، وہ بھی ہسٹری ہے، سرکس آیا تھا اس وقت میں امپرنٹ میں لکھتی تھی۔ ہر ماہ میرا ایک کالم ہوتا تھا تو اس کے لیے بھی میں سرکس دیکھنے گئی تو سرکس میں ساری لڑکیاں جو تھیں وہ ساؤتھ انڈیا کی تھیں کیرلل۔ ایک لڑکی جو تھی ان میں وہ اینگلو انڈین تھی تو وہ بڑی شارپ، بڑی فلسفیانہ باتیں کرنے لگی، کہنے لگی کہ میں اپنے لباس پر زرد رنگ کی تتلیاں چھپکا رہی تھی کٹ آؤٹ کے کام کی۔ تو مجھے ایسا لگا۔ یہ THEY ARE FROZEN SADNESS۔ منجمد اداسی، میں نے سوچا کہ یہ لڑکی جو تار پر چل رہی ہے باتیں بڑی شاعرانہ کر رہی ہے تو وہ لڑکی جو اینگلو انڈین تھی، مجھے بڑا FACINATE کیا ہمیشہ سرکس میں کام کرنے والی نے۔ یہ لڑکی جو تار پر چلتی ہیں۔ قلابازیاں کھاتی ہیں۔ کتنی مشکل کی کتنی محنت کی روٹی ہے اس کی۔ اس نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ وہی پس منظر تھا میرے ذہن میں۔ جس سے اس افسانے کی تخلیق ہوئی۔

جمیل اختر:

اور اپنے کسی ایسے افسانے کے بارے میں بتائیں جس کے بارے میں آپ سمجھتی ہیں کہ اس پر گفتگو نہیں ہو پائی ہے یا جس کی تفہیم میں دشواری ہے۔ تو اس کی نشاندہی آپ فرمائیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ 'داغ داغ اجالا' یہ افسانہ امروز 49 میں پاکستان میں چھپا تھا۔ وہ میں نے بالکل ایک مختلف تکنیک میں لکھا تھا۔ وہ تکنیک جو آج کل کیا ہوتا ہے کہ بڑی جدید تکنیک ہے میں نے اس وقت اس تکنیک میں لکھا تھا اور بہت سے افسانے ہیں جو اس وقت یاد نہیں آ رہے ہیں۔

جمیل اختر:

روشنی کی رفتار جو آپ کا افسانہ ہے۔ جو ٹائم اور اسپیس کے بارے میں ہے۔ سائنس فکشن لوگوں نے اس کو نام دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں صحیح ہے۔ سائنس فکشن ہے۔ بے شک ہے۔

جمیل اختر:

آج کل آپ کیا لکھ رہی ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

(اپنی اسسٹنٹ ریحانہ کو آواز دے کر پوچھتے ہوئے؟) ریحانہ۔ آج کل ہم کیا لکھ رہے ہیں (ریحانہ..... کار جہاں دراز ہے اور البم) کار جہاں دراز ہے لکھ رہے ہیں اور ایک البم بنا رہے ہیں۔ سو سال کی تصویریں سو سال کی جو چیزیں ہیں ادبی ہمارے اپنے خاندان کے تناظر میں سب رائٹرز ہیں۔ ان کے حوالے ہیں۔ (ریحانہ کو آواز دیتے ہوئے۔ ریحانہ ذرا وہ البم لا نا ان کو دکھادیں۔ ریحانہ البم کا مسودہ لاتی ہے اور پھر آپا اہم تصاویریں مجھے دکھلاتی ہیں۔ اسی بیچ میں سوال کرتا ہوں)۔

جمیل اختر:

اس کے علاوہ فکشن میں بھی کچھ لکھ رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں۔ ارے بھئی اتنا بڑا کام کر رہی ہوں۔ اردو میں ہوا ہی نہیں ہے آج تک۔ لوگ جانتے ہی نہیں ہیں اس طرح کی چیزیں۔

جمیل اختر:

افسانہ لکھنا آپ نے بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے، بہت زمانے سے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں ادھر بہت دنوں سے نہیں لکھا ہے۔

جمیل اختر:

آپا آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنا اتنا قیمتی وقت ہمارے اتنے طویل انٹرویو کے لیے عنایت فرمایا۔شکریہ۔

قرۃ العین حیدر:

آپ کا بھی بے حد شکریہ!

(نوٹ:یہ انٹرویو 17 اگست 2001 عیسوی کو خصوصی طور پر اس کتاب میں شمولیت کے لیے قرۃ العین حیدر کے گھر واقع نوئیڈا دہلی میں لیا گیا۔)

ہمارے ادیبوں کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں

گفتگو : شفیع عقیل (پاکستان)

پیش گفتگو!

یہ انٹرویو 1935 کی یادگار ہے۔ اس زمانے میں راقم الحروف نے اردو کے مشہور ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کے انٹرویوز پر مشتمل ایک سلسلہ ہفت روزہ 'چٹان' لاہور کے لیے شروع کیا تھا۔ اس وقت قرۃ العین حیدر کراچی میں تھیں، پاکستانی تھیں اور ماری پور میں رہائش پذیر تھیں اور وہ ایڈورٹائزنگ فلم اینڈ پبلی کیشنز میں بحیثیت اسکرپٹ رائٹر تھیں۔ یہ انٹرویو ان کے گھر پر لیا گیا تھا۔ (شفیع عقیل)

نوٹ: میں 1991 میں قرۃ العین حیدر پر تحقیقی مواد حاصل کرنے کے لیے پاکستان گیا تھا تو پاکستان کے بہت سے ادیبوں و فنکاروں سے ملاقات کی تھی۔ اور قرۃ العین حیدر اور ان کے فن کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں بہت سی نایاب چیزیں میرے ہاتھ لگیں۔ بہت سے تحقیقی و تنقیدی مضامین وانٹرویو جو قرۃ العین

حیدر سے متعلق تھے اور شائع نہ ہو سکے تھے۔ لوگوں نے میرے حوالے کر دیے۔ میں اس کرمِ خاص کے لیے ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں۔ شفیع عقیل صاحب نے بھی بے حد معاونت کی۔ جنگ کی فائلوں سے پرانے مضامین فراہم کروائے اور خود اپنا غیر مطبوعہ اور اہم انٹرویو بھی میرے حوالے کر دیا۔ میں ان کا خاص طور پر بے حد شکر گزار ہوں۔

(جمیل اختر)

شفیع عقیل:

آپ میں ادبی تحریک کا سبب کون سے واقعات تھے؟

قرۃ العین حیدر:

کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ اسے رجحان ہی کہنا چاہیے۔ ایسا کوئی حادثہ تو میرے ذہن میں نہیں ہے جس کی وجہ سے میں نے لکھنا شروع کیا ہو۔ گھر کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا۔ بچپن میں خود ہمیں بھی شوق تھا۔ غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

شفیع عقیل:

آپ اردو کے کس ادیب سے سب سے زیادہ متاثر ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

یہ کہنا تو بہت مشکل ہے۔ اردو نثر میں ایسا کون ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کا مقصد نثر نگاروں سے ہے تو قاضی عبدالغفار، ابوالکلام آزاد، سرشار اور تو خود میرے باپ تھے۔ یہ نہیں کہ ان کی نثر نے مجھے متاثر کیا بلکہ یہ لوگ میرے پسندیدہ لکھنے والوں میں سے تھے۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو میں اردو کے متعلق زیادہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی کیونکہ میں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کی ہے اور زیادہ تر انگریزی ادیبوں کو پڑھا۔

شفیع عقیل:

اردو کے قدیم شعرا میں سے آپ کسے پسند کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میر انیس اور میر کو۔ اس وقت اور کوئی یاد نہیں آ رہا ہے۔

شفیع عقیل:

کیا آپ کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، جس نے آپ کی تحریر پر اثر ڈالا ہو؟

قرۃ العین حیدر:

میرا خیال ہے کوئی ایسا واقعہ میری زندگی میں پیش نہیں آیا۔

شفیع عقیل:

آپ کا سب سے پہلا افسانہ کون سا ہے اور وہ کن حالات میں لکھا گیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

جب ہم نے لکھنا شروع کیا تھا اور شروع میں جو کہانیاں لکھی تھیں، وہ اس لیے نہیں لکھی تھیں کہ ادبی رسالوں میں شایع ہوں۔ ہم وہ کہانیاں ریڈیو اور کالج کے رسالوں کے لیے لکھتے تھے۔ اتفاق سے وہ 'ساقی' وغیرہ میں بھی چھپ گئیں۔ وہ کہانیاں بورژوا ماحول کی ہیں۔ وہ کم عمری کا زمانہ تھا۔ اسکولوں اور کالجوں میں اور خاص طور پر ہمارے ہاں لکھنؤ میں جو کچھ ہم لکھتے تھے وہ محض اس لیے لکھا جاتا تھا کہ چھپے گا اور لوگ پڑھیں گے۔ میرا خیال ہے جب میں نے شعوری طور پر لکھنا شروع کیا تو وہ 'میرے بھی صنم خانے' ہیں۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ لکھنے والے کا کوئی مقصد ہونا چاہیے۔ اب میں سمجھتی ہوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان میں پختگی آتی ہے۔ لامحالہ اپروچ بھی بدل گئی۔ اب جب میں اپنی ابتدائی کہانیاں دیکھتی ہوں جو زیادہ تر ڈرائنگ روم پر لکھی ہوئی ہیں تو مجھے انتہائی بے تکی سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن بعد میں میں نے جو چیزیں لکھی ہیں وہ مجھے پسند ہیں۔ میں نے جو ماحول دیکھا ہے، جس ماحول میں رہی ہوں، اسی پر لکھ سکتی ہوں۔ پرابلم تو ہر اسٹیج پر ہوتے ہیں۔ اب اگر میں لالوکھیت کے متعلق لکھنا چاہوں تو نہیں لکھ سکتی کیونکہ میں نے اس ماحول کو دیکھا ہی نہیں۔

شفیع عقیل:

کیا آپ کے خیال میں ادب کو سیاست سے الگ رہنا چاہیے؟

قرۃ العین حیدر:

بالکل نہیں۔ بھلا ادب سیاست سے الگ کیسے رہ سکتا ہے؟ اس وقت ہماری کون سی چیز سیاست سے الگ ہے جو ادب الگ رہے گا۔

شفیع عقیل:

کیا آپ ادب کی موجودہ رفتار سے مطمئن ہیں؟ اگر نہیں تو اس کی بہتری کے لیے آپ کے پاس کیا تدابیر ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میرا خیال یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے جو 'اپروچ' تھے وہ بالکل بدل گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے پرابلم بھی تبدیل ہو گئے اس لیے اگر ہم اس وقت کے ادب کے ساتھ اس وقت کے ادب کو ماپیں تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس وقت پورا ماحول بدل گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ لوگوں میں فرسٹریشن ہے۔ تاہم ہر شخص نے اپنی اپروچ کے مطابق لکھا۔ لیکن اگر اس وقت کے ادب اور اس وقت کے ادب کو دونوں پلڑوں میں تولیں تو یہ ناممکن ہے۔ اس وقت ہندستان میں ہم سے مختلف مسائل ہیں۔ وہاں اپروچ بھی بالکل مختلف ہے۔ آج کرشن چندر جو کچھ وہاں لکھ رہے ہیں، وہ یہاں کوئی ادیب نہیں لکھ سکتا۔ یہاں گزشتہ تھوڑے عرصہ میں بہت سے لوگوں نے ناول کی طرف خاص طور پر توجہ دی ہے اور بہت سے ناول لکھے جا رہے ہیں۔ یہ ایک بہت اچھا رجحان ہے۔ اور پھر اس دور میں ہمارے ہاں فیض نے جو کچھ لکھا ہے وہ کافی ہے۔

شفیع عقیل:

لیکن جو ناول ہمارے یہاں لکھے گئے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں کیا آپ انھیں اچھے ناول کہہ سکیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

یہ ٹھیک ہے کہ وہ ناول اچھے نہیں ہیں لیکن ان لوگوں نے شارٹ اسٹوری سے نکل کر ناول لکھنا شروع کیا ہے اور یہ ایک بہت اچھا رجحان ہے۔ ہمارے ہاں نظموں میں بھی بہت کچھ

ہوا ہے۔ ہمارے وہ ادیب جو عوامی کہلاتے ہیں، ہم ان پر بھی بلیم نہیں دے سکتے۔ اس دور میں میر کو خاص طور پر پسند کیا جا رہا ہے اور اس کی وجہ بھی ماحول کی یاسیت ہے جو اس وقت ہمارے ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ اس کے برعکس بھارت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ تقسیم کے بعد ہمارے ہاں کوئی بڑی تخلیق نہیں ہوئی، بالکل غلط ہے۔

شفیع عقیل:

آپ کے خیال میں اس وقت ہمارے ہاں جو یاسیت ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اگر ادب کا تعلق زندگی سے ہے تو ظاہر ہے ادب میں بھی یاسیت کا آنا ضروری تھا کیونکہ ہمارے ہاں کے حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ لوگوں کو نوکریاں نہیں ملتیں، الاٹمنٹ نہیں ہوتے۔ اس کا لامحالہ ادب پر اثر پڑے گا۔ ہمارے ہاں جو ادب میں فرسٹریشن ہے تو اس کی وجہ یہ کہ ہمارے ادیبوں کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں۔ اور اگر کسی کے سامنے کوئی مقصد ہے تو اس کو لیبل لگا دیا گیا ہے۔ کچھ لوگ اسلامی ہیں اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے ایلیٹ کو اپنا لیا ہے۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں۔ ابھی تک ہم لوگ ذہنی طور پر فیوڈل ہیں۔ ابھی کیپٹل ازم کی اسٹیج بھی نہیں آئی جہاں کچھ کوشش ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ادیبوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ادیب لکھیں تو پھر کھائیں کہاں سے؟ اس لیے انھیں قدم قدم پر سمجھوتے کرنا پڑے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں ادیبوں کی کوئی آرگنائزیشن نہیں جہاں ان کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

شفیع عقیل:

موجودہ افسانہ نگاروں میں آپ کے خیال میں کون اچھا لکھتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اس وقت کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اچھا لکھتا ہے۔ اس کی کہانیاں وقت کی کہانیاں ہیں اور ہر کہانی میں ایک مقصد ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ ہمارے

ہاں نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو مجھے بہت پسند آئیں۔ اس کی اپروچ خوبصورت ہے۔ وہ اپنے ہاں کے مسائل کو بڑے اچھے طریقے سے ہینڈل کرتی ہے۔ اس کے ہاں تصنع بالکل نہیں وہ ڈائریکٹ لکھتی ہے۔ عصمت چغتائی مجھے بہت پسند ہیں۔ اشفاق نے ایک آدھ چیز اچھی لکھی ہے۔ ہاجرہ مسرور نے دو تین چیزیں اچھی دی ہیں۔ اس کی بعض کہانیاں بہت پسند کی گئیں ہیں اور اچھی ہیں۔ اور عزیز احمد کا صرف ایک ناول 'گریز' اچھا ہے۔

شفیع عقیل:

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ندیم کی وہ کہانیاں جو دیہات کے متعلق ہیں شروع میں اچھی لگتی تھیں لیکن بعد میں ان کے ہاں شاعری زیادہ آ گئی۔

شفیع عقیل:

موجودہ دور کے شاعروں میں آپ کے نزدیک کون سا شاعر اچھا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

فیض ہیں، مجاز ہیں۔ ہماری ایک پوری جنریشن ہے جو ان کو پسند کرتی ہے اور انھیں پڑھ کر آگے بڑھی ہے۔ فراق کی 'روپ' اور اس کی 'غزل'، مجھے دونوں پسند ہیں۔

شفیع عقیل:

آپ کے خیال میں ہمارے ہاں اچھا ناول نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اردو میں اچھا ناول نہ ہونے کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ جب کوئی انسان لکھنے بیٹھتا ہے تو شعوری طور پر اس کے سامنے اپنے ادب کا ذخیرہ ہوتا ہے تو اس کی طرف جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں کوئی ایسا ادبی ذخیرہ تھا ہی نہیں۔ ہمارا ماحول جو رہا ہے اس میں افسانے کی زیادہ گنجائش تھی۔ لوگوں نے بنگالی ناولوں کے ترجمے پڑھے تو ٹیگور پر آ کر جم گئے۔ مرزا محمد سعید جیسے

پرانے اسکول کے جو لوگ تھے انھوں نے بھی اپنا مواد انگریزی ہی سے لیا۔ میرے خیال میں اچھا ناول نہ ہونے کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

شفیع عقیل:

مرزا رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

'امراؤ جان ادا' سب سے اچھا ناول ہے۔ اس کو دیکھتے وقت ہمیں یہ بھی اپنے ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ وہ آج سے پچاس سال پہلے کا ناول ہے۔ اس کے علاوہ پریم چند کے بعض ناول 'چوگانِ ہستی' اور 'گئو دان' وغیرہ اچھے ناول ہیں۔

شفیع عقیل:

بیدی کے افسانوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اچھے ادیبوں کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ وہ تو ہیں ہی اچھے۔

شفیع عقیل:

انگریزی کے قدیم ادیبوں میں آپ کسے زیادہ پسند کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

انگریزی لٹریچر تو میرا سبجیکٹ ہے۔ انگریزی کے کلاسکس کے متعلق کسی ایک کا نام لینا بہت مشکل ہے۔ قریب قریب سبھی پسند ہیں۔ آپ مجھ سے ماڈرن رائٹرز کے متعلق پوچھیے۔

شفیع عقیل:

چلیے جدید ادیبوں ہی کے متعلق بتا دیجیے۔

قرۃ العین حیدر:

ماڈرن رائٹرز میں سے مجھے ورجینیا وولف، گراہم گرین، جوائس سیر دیان وغیرہ بہت پسند ہیں۔

شفیع عقیل:

آپ کے خیال میں آپ کا سب سے اچھا افسانہ کون سا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے اپنا افسانہ 'جلاوطن' بہت پسند ہے جو میرے مجموعہ 'شیشے کے گھر' میں ہے۔ میں نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے جو The Exiles کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں ایک بڑا بھاری پرابلم پیش کیا گیا ہے۔ ذہنی جلاوطنی اس کا موضوع ہے۔

شفیع عقیل:

اپنی کتابوں میں آپ کو کون سی کتاب پسند ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کتابوں میں کسی ایک کے متعلق کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے 'میرے بھی صنم خانے' زیادہ اچھی ہے اور مجھے بھی یہی زیادہ پسند ہے۔

(1953، غیر مطبوعہ)

میرے افسانوں میں بہت ورائٹی ہے

گفتگو : یونس اگاسکر، انور قمر، افتخار امام صدیقی

یونس:

اس سے قبل کہ ہماری گفتگو کا آغاز ہو میں ایک بات کی وضاحت چاہوں گا کہ آپ کے ترقی پسند ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کچھ کنفیوژن سا پایا جاتا ہے۔ کیا آپ واقعی ترقی پسند نہیں ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

یہ تو بہت عجیب و غریب سوال ہے۔ ترقی پسندی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ پہلے مجھے یہ بتائیے۔

یونس:

میرا مطلب اس تحریک سے ہے جو 1936 کے لگ بھگ لکھنؤ سے شروع ہوئی۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! میں نے لکھنا شروع کیا ہے 1945 کے آس پاس اس وقت میں کم عمر تھی اور مجھے

زیادہ پتہ نہیں تھا کہ ترقی پسند تحریک کیا ہے۔ میں نے ایک ہوبی کے طور پر لکھنا شروع کیا، کیونکہ میرے گھر کا ماحول لکھنے پڑھنے کا تھا اور مجھے خود شوق تھا اور میں لکھتی چلی گئی۔ میں نے جو کچھ لکھا اپنے ماحول کے بارے میں لکھا جو کہ اس وقت ایک بڑی انوکھی چیز سمجھی گئی۔ لوگوں نے کہا کہ نہ جانے کس دنیا کی باتیں کرتی ہیں حالانکہ میں اپنے ہی ماحول کی فیوڈل Westernised Upper Class کی بات کرتی تھی۔ حال ہی میں جب میں نے 'ستاروں سے آگے' کے افسانے پڑھے تو مجھے خود حیرت ہوئی کہ میں کیا لکھتی تھی۔ وہ لڑکیاں کانونٹ کالج میں پڑھ رہی ہیں، فوجی افسر ہیں پارٹیاں ہیں، کلب ہیں، ڈانسیز ہیں وہ پورا میلیو ہندستان کے بہت ہی محدود طبقے کا تھا جن کے یہاں کئی نسلوں سے مغربیت موجود تھی اور Sophistication تھا۔ یہ ایک خاص طبقہ تھا برٹش انڈیا کا جس کو آپ لوگ اب نہیں سمجھ سکتے کیونکہ آپ لوگ اس دور کے بعد پیدا ہوئے ہیں برٹش انڈیا کا اپنا ڈپلنگ والا ایک ماحول تھا جس میں میں نے آنکھ کھولی تھی اور جس طبقے میں میں نے آنکھ کھولی تھی اس میں یہی کچھ ہوتا تھا اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ یہ بڑی کھوکھلی زندگیاں تھیں۔ باہر ایک تحریک چل رہی تھی ترقی پسندی کی یا سیاسی بائیں بازو کی تحریک، وہ بھی اتفاق سے میرے گھر میں موجود تھی تھوڑی بہت میں اس کو بھی دیکھتی اور سوچتی تھی یہ دونوں تحریکیں یعنی ایک طرف زندگی صرف اس قسم کی کہ کانونٹ اسکول ہیں، مسوری ہے، دہرہ دون ہے، کلب ہیں، بال روم ڈانسیز ہیں اور انگریزوں کے سائے میں یہ پوری دنیا آباد ہے۔ اس کے علاوہ اسی طبقے میں سے کچھ لوگ چلے گئے تھے اور انگریز کے خلاف لڑ رہے تھے کانگریس پارٹی تھی یا کیمونسٹ پارٹی تھی۔ اس کا ادب پر بڑا اثر پڑا تھا۔ اُردو فکشن کا جو نیا دھارا تھا وہ یہیں سے آیا تھا۔ میں ایک مختلف جزیرے میں بیٹھی لکھ رہی تھی۔ میں نے جس وقت پہلے پہل لکھنا شروع کیا تو میری عمر چودہ یا پندرہ سال کی تھی اور جب میرا پہلا افسانہ شائع ہوا تھا۔ لیکن مجھ کو یہ احساس تھا کہ یہ بڑی کھوکھلی زندگی ہے اور میں نے اس کھوکھلے پن کے متعلق لکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے جب تیس برس بعد 'ستاروں سے آگے' کے افسانے پڑھے تو مجھے بہت حیرت ہوئی اس میں بہت شعریت ہے اسٹائل میں، بہت Sensitivity ہے۔ بہت خوبصورت ماحول ہے۔ یعنی وہی ماحول ہے جو میرے اپنے

گھر کا تھا۔ کوئی چیز میرے لیے انوکھی نہیں تھی لیکن پڑھنے والوں کے لیے وہ چیزیں انوکھی تھیں۔ تو میں نے اب پڑھنے کے بعد اندازہ یہ لگایا کہ میں ان چیزوں سے مطمئن نہیں تھی اور مجھے یہ بھی احساس تھا کہ ان میں سے بہت سی چیزوں کو بدلنا چاہیے لیکن میں جو لکھ رہی تھی وہ میرا لکھنا بالکل مجبوری تھا۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بورژوا رومانیت ہے یا اور کچھ۔ ویسے بھی میں بورژوا طبقے سے تعلق نہیں رکھتی ہوں، میرا طبقہ فیوڈل ہے جو نئی بورژوائی کے خلاف تھا۔ میں نے 'کار جہاں دراز ہے' میں لکھا ہے کہ میرے والد کے ایک دوست تھے چچا مشتاق احمد زاہدی۔ ان کی ہمت افزائی سے میں نے لکھنا شروع کیا۔ ان دنوں میرے پاس پرکاش پنڈت کا خط آیا تو انھوں نے لکھا کہ ''آپ کے افسانے بہت خوبصورت ہوتے ہیں گو ان میں بورژوائیت ہوتی ہے۔'' اس پر میں نے چچا زاہدی سے پوچھا کہ بورژوائیت کیا چیز ہوتی ہے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ تم فکر نہ کرو، جیسے لکھتی ہو لکھتی رہو۔ جس وقت میں پاکستان گئی میں نے 'میرے بھی صنم خانے' لکھنا شروع کر دیا تھا اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے تقسیم کا مجھے بڑا سخت صدمہ تھا۔ اس وقت تک مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ 'میرے بھی صنم خانے' میں وہی ماحول، وہی کردار، وہی سارا قصہ پورا موجود تھا۔ جیسے پورا سیٹ لگا ہوا تھا اور میں نے ناول لکھنا شروع کر دیا۔

یونس:

اس وقت آپ نے جو افسانے لکھے یا ناول، اس وقت کے نظام کے ٹوٹنے کا آپ کو شدید احساس تھا۔

قرۃ العین حیدر:

اس وقت تو نظام ٹوٹ رہا تھا، میرے سامنے ٹوٹا ہے۔ میں نے اپنے گھر میں دیکھا کہ وہ نظام ٹوٹ رہا ہے، براہ راست ہم لوگ اس سے متاثر ہوئے اور میں اتنا ضرور کہوں گی کہ اس نظام سے مجھے محبت تھی گو میں یہ سمجھتی کہ یہ بڑی غلط چیز ہے یعنی نظام بذات خود کافی غلط ہے لیکن یہ میرا اپنا نظام تھا۔ آپ کے دادا یا آپ کی دادی اگر نامعقول ہوں پھر بھی آپ کے دادا، دادی تو ہیں۔ آپ ان کو Deny تو نہیں کر سکتے۔ اس نظام میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ کردار سازی اس کی سب

سے بڑی خوبی تھی، اس کا سب سے بڑا Contribution تہذیب کی آبیاری ہے۔ تو ترقی پسند تحریک جو آپ فرما رہے ہیں اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اس کی کسی میٹنگ میں شریک نہیں ہوئی۔

یونس:

آپ کا نام ترقی پسندوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ترقی پسندوں میں شامل کرنا کوئی گالی نہیں۔ ترقی پسند ہونا بڑی اچھی بات ہے یعنی آپ مجھے یہ بتائیے کہ Eternal Verities کہ معاشی انصاف ہونا چاہیے اور ایمان داری ہونا چاہیے اور جو بے ہودگیاں ہو رہی ہیں یہ نہیں ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے میں یہی کہوں گی کہ یہ سب نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا یہ جو مطلب ہے کہ میں ترقی پسند تحریک میں شامل تھی یا ترقی پسندوں کے جلسوں میں شریک ہوتی تھی، میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ میں جس وقت پاکستان گئی تھی میری عمر بہت کم تھی لہٰذا اس گروپ میں شامل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور کچھ میرے جو رشتہ دار اس میں شامل تھے وہ مجھ سے بہت سینئر تھے۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا تعلق ہے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس کا بہت Positive Contribution ہے۔ اگر ترقی پسند تحریک نہ ہوتی تو اردو ادب جیسا آپ دیکھ رہے ہیں، یہ نہ ہوتا۔

افتخار:

افسانوں کے ساتھ ساتھ آپ نے سب سے پہلا ناول کون سا لکھا؟

قرۃ العین حیدر:

'میرے بھی صنم خانے'۔

افتخار:

دراصل یہ ایک ترتیب ہے جس سے آپ کے سارے ناول یکے بعد دیگرے آ جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

سب سے پہلے میری کتاب چھپی 'ستاروں سے آگے'۔ اس کے بعد 'میرے بھی صنم خانے' 1949 میں چھپی۔ اس کے بعد 'سفینۂ غم دل'... اس کا اسٹائل، اس کی جو نثر ہے وہ میں نے اب پڑھا تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ بہت شاعرانہ نثر ہے۔

افتخار:

آپ کا ناولٹ 'چائے کے باغ' بہت مشہور ہوا؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے یہ مشہور ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری ساری کتابیں پاکستان میں چھپیں اور ہر کتاب کے بہت سارے ایڈیشن نکل آئے ہیں اور اسے چور چھاپتے ہیں... چور پبلشر۔ یہ کتابیں پاکستان میں چھپتی ہیں، متعدد ایڈیشن نکلتے ہیں۔ جو کتابیں یہاں نہیں چھپتیں وہ وہاں چھپ جاتی ہیں۔

انور قمر:

آپ کو رائلٹی تو ملتی ہوگی؟

قرۃ العین حیدر:

جی نہیں، کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں چونکہ کوئی پبلشر نہیں ہے اس لیے میری کتابیں شائع نہیں ہوتیں۔ ہاں چند رسائل میں کبھی کبھی کچھ چیزیں شائع ہو جاتی ہیں۔ تو یہ کہنا کہ 'چائے کے باغ' مقبول ہوا، کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ بہت اچھا ناول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے سردار جعفری صاحب نے چھاپا تھا 'حلقۂ ادب' سے اور کسی نے اسے عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر دیا اور کسی عقل مند آدمی نے کہا کہ بہت بے ہودہ ناول ہے اس لیے اسے نصاب سے نکال دیا۔ مجھے ان چیزوں سے نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ میرے نزدیک ان کی کوئی اہمیت۔ میرے خیال میں میرا جو سب سے اچھا ناولٹ ہے وہ آپ لوگوں نے پڑھا ہی نہیں اور وہ ہے 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو' اور وہ چھپا ہے 'بیسویں صدی' میں چار قسطوں میں۔

افتخار:

میں نے وہ قسطیں پڑھیں ہیں، وہ اپنے عنوان ہی سے متاثر کرتا ہے۔ 'چائے کے باغ' کے متعلق یہ کہنا ہے کہ بیش تر تنقید نگاروں نے ناول پہ تنقید لکھتے ہوئے اس کے پلاٹ اور اس کی تکنیک کے اعتبار سے اسے اچھوتا قرار دیا۔

قرۃ العین حیدر:

(ہنستے ہوئے) وہ کون کون نقاد ہیں۔ کوئی کچھ لکھے یا نہ لکھے، اگر کسی نقاد نے اسے اچھا یا برا کہہ دیا تو کیا یہ کوئی سرٹیفکیٹ ہے؟ دیکھیے میں آپ سے یہ عرض کروں کہ فیصلہ کرنے والا، پسند یا ناپسند کرنے والا جو ہوتا ہے وہ ہوتا ہے قاری۔

یونس:

جب آپ کے ناولوں کا ذکر آ گیا تو میں دریافت کروں کہ 'سفینۂ غم دل' اور 'میرے بھی صنم خانے' میں کوئی بنیادی فرق محسوس کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

'میرے بھی صنم خانے' کے بعد 'سفینۂ غم دل' بھی لکھنؤ کی۔ ناسٹالجیا کی ہی ایک کڑی تھی۔ (وطن کی یاد Home Sickness)

یونس:

کیا یہ دونوں ناول مل کر ایک اکائی بناتے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

کوئی اکائی وکائی نہیں بناتے۔ چھوڑیے پرانی بات ہے، لکھا تھا جب لکھا تھا۔ میں ان ناولوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ اسی ناسٹالجیا کی بنیاد پر انھیں کرداروں کو لے کر بقول شخصے تاش کی گڈی میں سے تاش کے پتے نکال وہی کھیل دوبارہ پھیلا دیا۔

افتخار:

سوال ایک اور موڑ لیتا ہے کہ آپ کے نزدیک۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا آپ کیسے لکھتی ہیں... یہ بات... یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ یہ بالکل انسان کا لکھنے کا فلو ہوتا ہے.. بس لکھ لیا ہم نے۔ اب میں بیٹھ کر سوچوں کہ یوں تکنیک بنائی، یوں شعور کی رو نکالی، فلانا کیا۔ ورجینیا وولف کو پڑھا یعنی لوگوں نے یہاں تک کہا کہ میں نے Orlando پڑھ کے 'آگ کا دریا' لکھا ہے یعنی اس سے زیادہ حماقت کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم لوگ بنیادی طور پر اتنے نقال واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں فلمیں نقل ہی کی جاتی ہیں، ادب نقل ہوتا ہے، ہمارے ہاں شاعری نقل ہوتی ہے۔ آپ کی جو یہ جدید شاعری ہے یہ کہاں سے آئی ہے۔ مرزا غالب کے ہاں سے آئی ہے؟ یہ تو آپ نے ویسٹ سے لی ہے۔ اس قدر ہمارے اعصاب پر مغربیت سوار ہے کہ کوئی چیز بھی اوریجنل لکھیں تو لوگ کہیں گے کہ آپ نے Orlando سے لیا ہے۔ آپ نے فلاں سے لیا ہے، فلاں سے لیا ہے۔ اگر میرے لیے ایسا کہتے ہیں تو کہنے دیجیے، میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یونس:

میرے خیال میں یہ بات صرف 'آگ کا دریا' کے لیے کہی جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

'آگ کا دریا' کے لیے ہوگی لیکن میں نے اتفاق سے 'آگ کا دریا' کے لیے کسی کی نقل نہیں کی۔ اگر میں انکسار نہیں برت رہی تو میرے خیال میں میں ایک اوریجنل ٹیلنٹ کی خاتون ہوں۔

یونس:

شاید آپ کو یاد ہو کہ 'اُداس نسلیں' کے بارے میں ایسا کہا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

'اُداس نسلیں' میں تو انھوں نے میرے پورے پورے پیراگراف نقل کر دیے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ میرے ناول میں ایک کردار ہے کمار چٹوپادھیہ۔ 'اُداس نسلیں' میں انھوں نے اپنے

کردار کو بھی چٹو پادھیہ کا خطاب دیا۔

افتخار:

'آگ کا دریا' کو ہم تھوڑا بعد میں لے لیں گے اور اس پر آپ سے تفصیلی بات کریں گے کیونکہ اس ناول پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ بہت زیادہ تعریفیں، تنقیدیں ہوئی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ شعور کی رو، تکنیک پر سب سے پہلا اور جامع ناول یہی لکھا گیا۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے آپ اسے کچھ بھی کہہ لیں۔ ''شعور کی رو'' کہہ لیں یا آزاد تلازمۂ خیال کہہ لیں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک ناول لکھا۔ میں نے اس میں مختلف اُدوار کے متعلق لکھا اور اس میں STREAM OF TIME تھا۔ بہت سوں نے تو یہ بھی کہا کہ اس میں آواگون ہے وغیرہ وغیرہ۔

انور قمر:

جو زبان آپ لکھتی ہیں یا جو علامتیں آپ استعمال کرتی ہیں اور فلسفیانہ رموز کی طرف آپ اشارے کرتی ہیں، تو کیا آپ صرف INTELLECTUALS ہی کے لیے لکھتی ہیں۔

قرۃ العین:

دیکھیے میں لکھتی ہوں، کچھ لوگ پڑھتے ہیں کچھ لوگ نہیں پڑھتے۔ میں یہ سوچ کر نہیں لکھتی کہ اسے صرف INTELLECTUAL ہی پڑھیں گے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اب لوگ ہمارے یہاں پڑھ ہی نہیں رہے ہیں۔ ہمارے یہاں لوگوں کو پڑھنے کا شوق نہیں رہا۔

یونس:

آپ کے یہاں بعض قصے اور باتیں ایسی آتی ہیں جس کے لیے ذاتی مطالعہ بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ذاتی مطالعہ تو بہرحال بے حد ضروری ہے۔

افتخار:

تخلیقی افسانہ یا نئی کہانی کے بارے میں کہتے ہوئے تکنیک، فضا اور موضوع کے لیے ایک معتبر نام آپ کا لیا جاتا ہے اور آپ کے بعد نئے افسانے کے تناظر میں کئی نام اُبھر کر آئے اور جنھوں نے قدیم افسانے سے انحراف کیا، تاہم یہ انحراف روایت کی شکل میں تبدیل نہیں ہوا کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے نیا افسانہ ابھی شروع نہیں ہوا ہے بلکہ یہ تو 1930 سے شروع ہو چکا تھا منٹو کے زمانے سے، اگر آپ یہ کہیں کہ نیا افسانہ آج شروع ہوا ہے اور اس سے پہلے لوگ گھاس کھود رہے تھے تو یہ بڑی دھاندلی کی بات ہے۔ کرشن چندر، محمد حسن عسکری کے افسانے یا غلام عباس کے افسانے یا اختر اورینوی اور احمد علی یہ لوگ تو ہمارے نئے افسانے کے پائینرز تھے۔ ان لوگوں کو بھلا دینا بڑی غلط بات ہے۔ محمد حسن عسکری کے افسانوں کا ایک مجموعہ تھا ''پھسلن'' آپ نے یہ افسانے پڑھے ہیں تو آپ کا کیا خیال ہے کیا یہ افسانے پرانے ہیں؟

یونس:

پریم چند کے افسانے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

پریم چند کو چھوڑیئے۔ ان کا ایک افسانہ ''کفن'' صرف موڈرن تھا باقی ان کے سارے افسانے تکنیک کے اعتبار سے بھی پرانے ہیں۔ ٹیگور کی روایت بھی موڈرن نہیں۔ ادب میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ بھی اچھی چیز ہے کہ نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ اب اس میں دس افسانے بُرے ہیں تو دو افسانے اچھے بھی لکھے جائیں گے مگر اس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ اس سے پہلے کچھ نہیں ہوا غلط بات ہے۔ ممکن ہے دو تین سال بعد نئے لوگ آئیں، ایک نیا گروپ آئے نوجوانوں کا، اور وہ کہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب بکواس ہے اس کے آگے ہم کچھ اور لکھیں گے۔ ادب میں تو یہ پروسس چلتی ہی رہتی ہے۔ آرٹ کے جتنے اسکول

ہیں مغرب میں یا موسیقی میں۔ دیکھیے موڈرن ازم کا جو Concept ہے Abstract جو آیا ہے جدید ادب میں یہ تینوں جگہ ایک ساتھ آیا۔ آرٹ میں، لٹریچر میں، پینٹنگ میں، ہمارے یہاں میوزک میں نہیں آسکتا۔ آرٹ میں آیا۔ ہمارے یہاں امرتا شیرگل، ٹیگور خاندان نے اسے شروع کیا تھا۔ یہ لوگ مغرب سے متاثر ہوئے تھے۔ امرتا شیرگل جب پیرس سے لوٹ کر آئی ہیں تب انھوں نے وہ پینٹنگس کیں جن کی وجہ سے ہم ان کو FOUNDER OF MODERN INDIAN ART کہتے ہیں، جسے موڈرن آرٹ کہا جاتا ہے ہندستان میں۔ اور یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ ادب میں خاص طور پر نثر میں جو نئی چیزیں آئیں وہ سب ویسٹرن ہیں۔ یعنی اگر وکٹورین ناول نہ ہوتا، اگر وکٹورین Morality نہ ہوتا تو ڈپٹی نذیر احمد نہ ہوتے مولوی نذیر احمد وکٹورین Moralist ہیں۔ شرر کو جوش دلایا والٹر اسکاٹ نے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف لکھ رہا ہے۔ میں عیسائیوں کے خلاف لکھوں گا اور جو مسلمانوں کے ساتھ بے انصافیاں ہوئی ہیں میں ان کا بدلہ لوں گا۔ ہم تو انیسویں صدی ہی سے ویسٹ کو Follow کر رہے ہیں۔ مغرب میں پیدا ہونے والی ہر نئی تحریک کا اثر نہ صرف اُردو میں آیا بلکہ پورے ایشیا میں آیا ہے، آپ جا کے ایران میں دیکھیے، ترکی، سیریا وغیرہ وغیرہ ہر نئی تحریک سے متاثر ہوئے اور ان ہی کی وجہ سے وہاں کے موڈرن لٹریچر بنے۔ ترکی میں موڈرن لٹریچر پیدا نہ ہوتا اگر ترک انیسویں صدی عیسوی میں پیرس نہ جاتے۔ ترقی پسند تحریک سے چند نئے دروازے کھلے مغرب کی طرف جانے کے۔ یوں ہر چیز جب لکھی جاتی ہے موڈرن ہوتی ہے۔ جب Plato لکھ رہا تھا تو وہ بھی موڈرن تھا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ میں ماضی میں لکھ رہا ہوں۔ یہ پوپ آرٹ لیجیے وہ لوگ تو اس سے بھی بہت آگے نکل گئے ہیں۔ وہ حالت پیرس کی جو میں نے 1951 عیسوی میں دیکھی وہ اب یہاں ہے۔ کتنا فرق ہوا۔

افتخار:

پھر بھی ان دنوں جو افسانے آپ پڑھ رہی ہیں تو انھیں پڑھتے ہوئے آپ محسوس کرتی ہیں کہ اگر ان میں کوئی انحراف کی شکل پیدا ہو رہی ہے تو وہ آگے چل کر کیا ہو سکتی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے شکل کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز بذات خود اچھی ہے یا اس میں کوئی چیز ایسی ہے جو اُسے باقی رکھے گی وہ زندہ رہے گی چاہے وہ کچھ بھی ہو۔ اگر آپ بے تکے پن کی کوئی بات لکھیں یا کوئی ایسا عنوان لکھیں جیسے ابھی حال میں ایک افسانہ الفاظ میں آیا تھا ''بڑی کی مٹھی میں سور کا کوڑھی'' یا ''کوڑھی کی مٹھی میں سور کی بڑی'' اگر آپ یہ سوچ لیں کہ اس طرح بہت ہی انوکھے، چونکا دینے والے، بے تکے، ہولناک عنوان کے ساتھ ہم ایک افسانہ لکھیں محض فارمولا بنا کے تو یہ غلط چیز ہے۔ اس طرح سے بھی آپ لکھیں لیکن اچھا ہو تو وہ زندہ رہے گا۔ ہزاروں ادیب ہزاروں شاعر آ کر چلے گئے جو اچھے تھے وہ باقی رہ گئے۔

یونس:

جدید افسانہ نگار اپنا سلسلہ منٹو، بیدؔی اور آپ سے جوڑتے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک ہے، جوڑتے ہیں تو اچھا کرتے ہیں۔

افتخار:

نئی کہانی یا تخلیقی کہانی کا ذکر کرتے ہوئے آپ کو نہ صرف ایک معتبر آواز کہا جاتا ہے بلکہ آپ ہی سے اس کی ابتدا سمجھی جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں جو افسانے لکھتی ہوں وہ اکہرے نہیں ہوتے۔ ان افسانوں میں کوئی نہ کوئی تہہ داری ضرور ہوتی ہے اور تکنیک کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں اور شروع سے رہے ہیں۔ یہ میں نے بالکل غیر شعوری طور پر کیا۔ اب یہاں ایک تضاد ہوگا۔ میں جو یہ کہتی ہوں کہ ہر چیز مغرب سے لی ہوئی ہے تو میرے افسانے اور یجنل کیسے ہیں۔ اس کے لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ میری پوری تعلیم و تربیت MENTAL BACKGROUND انگلش ہے حالانکہ یہ بات بڑی بے وقوفی کی لگتی ہے میری پوری امیجری انگلش ہے۔ میرے سارے افسانوں کا ماحول ہی انگلش ہے، ساتھ ساتھ

ہندستانی بھی یعنی ڈرائنگ روم بھی تھا اور دیوان خانہ بھی۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے ان دونوں کا اثر قبول کیا۔ اب میرا جب ذائنٹ ہی وہ رہا ہو تو میں اسی انداز سے سوچوں گی، اسی انداز سے لکھوں گی۔ لہٰذا میرے شروع کے سارے افسانوں میں کانونٹس کے ماحول، کرسمس کے گانے گائے جا رہے ہیں تو پورا کا پورا جو میرا ماحول تھا اسے میں لکھتی چلی گئی I merely wanted to express my self میری اور کزن ہیں انھوں نے اپنے اظہار کے دوسرے راستے منتخب کیے۔ کوئی پینٹنگ کرنے لگیں، کوئی ستار بجانے لگیں۔ مجھے چونکہ لکھنے کا شوق تھا لہٰذا میں لکھنے کی طرف مائل ہوگئی۔ میں نے کبھی یہ شعوری طور پر نہیں کیا۔ "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" جو میں نے 1949 میں لکھا تھا آپ پڑھ کر دیکھیے اور اسے آج کے ماحول میں رکھ کر دیکھیے جو افسانے آج لکھے جا رہے ہیں تو آپ بتائیے کہ کیا فرق ہے۔ یہ 29 سال پہلے کا افسانہ میں نے Spontaneously لکھا تھا۔ اس میں بہت سی باتیں ہیں اگر آپ تجزیہ کرنے بیٹھیں تو میرا اپنا بیک گراؤنڈ ظاہر ہوتا ہے کہ لنگڑی بھیڑیں ہیں جو بیت اللحم میں جا رہی ہیں پیدا ہونے کے لیے۔

"ستاروں سے آگے" میں آپ جتنے کردار پائیں گے وہ زیادہ تر میرے اسکول یا کالج کی لڑکیاں ہیں یا اُن کا "ٹائپ"۔

انور قمر:

گفتگو کو دوسرا موڑ دینے کے لیے ذرا اس تصویر کو ملاحظہ فرمائیے۔ حنیف رامے صاحب نے یہ اسکیچ بنایا تھا "فصل گل آئی یا اجل آئی" پر جو سویرا لاہور میں شایع ہوا تھا، اس اسکیچ میں آپ کو مصلوب کر دیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا یہ میں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم۔

انور قمر:

اقتدار کا دامن آپ کے ہاتھوں میں دیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اور یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ شاید 1945 میں شائع ہوا تھا۔

انور قمر:

آپ کے سر سے سورج طلوع ہو رہا ہے اور آپ نے اپنی فکر کو زبان عطا کی ہے اور آپ دونوں ہاتھ باندھے فخر سے کھڑی ہوئی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ اسکیچ تو آج میں نے دیکھا ہے۔ دیکھا تو اُس وقت بھی تھا لیکن غور نہیں کیا تھا اس پر میرا نام بھی لکھا ہوا ہے۔

افتخار:

لوٹ کر اب ہم ان دو سوالوں کی طرف آتے ہیں جن میں آپ نے تردید کی تھی کہ آپ ورجینا وولف سے متاثر نہیں ہوئی تھیں اور نہ ہی آگ کا دریا اس کی کوئی ایسی مثال ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں۔ لیکن ''سفینۂ غمِ دل'' میں ورجینا وولف سے متاثر ہوئی تھی۔

افتخار:

سفینۂ غمِ دل پہلے اور آگ کا دریا بعد میں؟

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! لیکن Orlando سے میں قطعی متاثر نہیں ہوئی اور بے وقوف ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں۔ کہنے دیجیے۔ ویسے آپ میری کتابوں کی الماریوں کو دیکھیں تو آپ بہ خوبی اندازہ لگالیں گے کہ میرے پسندیدہ Writers کون کون سے ہیں۔ ورجینا وولف کی Intensity of the living moment مجھے پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک خاص Sensitivity صرف عورت ہی کا حصہ ہے چاہے وہ کیتھرین مینسفیلڈ ہوں یا ورجینا وولف یا ایلزبتھ بودن۔

افتخار:

''آگ کا دریا'' ناول کی تکنیک کا آپ نے باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا۔

قرۃ العین حیدر:

میں ابھی آپ سے وضاحت کر چکی ہوں کہ میں نے ''شعور کی رو'' تکنیک کو خاص طور پر مدنظر رکھ کر ناول نہیں لکھا۔ یہ میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ یہ کیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں تکنیک کو مدنظر رکھ کر ناول لکھا۔ میں نے بس لکھنا شروع کیا اور میں لکھتی چلی گئی۔ مجھے صرف یہ خیال آیا کہ ہندستان کی تقسیم کے بارے میں لکھوں کہ ایسا کیوں ہوا۔ میں نے یہ ناول 1955 عیسوی میں لکھنا شروع کیا اور دسمبر 1959 عیسوی میں یہ شائع ہوا۔ اسے میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے لکھا۔

افتخار:

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے قبل سجاد ظہیر کا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' اسی تکنیک پر آیا تھا لیکن اس کی واضح شکل پھر آپ کے یہاں اُبھر کر آئی ''سفینۂ غم دل'' میں اور پھر اس کے بعد 'آگ کا دریا' میں۔

قرۃ العین حیدر:

مجھے یاد نہیں کہ میں نے ''لندن کی ایک رات'' کب پڑھی ہے۔ اس میں Time Stream ہے میرے یہاں سارا وقت مستقل Contemporary ہے مستقل Parallel ہے۔ مجھے سائنس کا قطعی کوئی Idea نہیں ہے لیکن میرا یہ خیال ہے اور جدید سائنس نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ All Time is contemporary اب یہ بات بالکل فلسفے اور مابعد الطبیعات میں چلی جاتی ہے۔ میں وقت لوٹا کر نہیں لاتی ہوں وقت برابر آگے بڑھتا گیا ہے۔

یونس:

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی بھی ہے لیکن Time is progressive, Time is not

اور میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں جیسے میں نے جو یہ گوتم نیلمبر رکھا ہے یہ ایک سمبل ہے ٹائم کا۔ cyclic
Intensity of thought in different ages. People in every age have thought and faced certain problems.

افتخار:

اُردو ناول کے ایک اور اہم نقاد......

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے نقاد یا کسی اہم نقاد کا تعلق ہے تو میں آپ کا سوال شروع ہونے سے پہلے ہی بتادوں کہ ہمارے ہاں ادب میں ایک Anti-Intellectual Attitude چل رہا ہے۔ ان دنوں پڑھنے کا شوق نہیں رہا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے تو میں نے لکھا بالکل انٹ سنٹ۔ Emotionally 'سفینۂ غم دل' تک میں نے اسی طرح لکھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے لکھنے کو بے حد سنجیدگی سے لیا اور اس کے لیے میں بیک گراؤنڈ ریسرچ کرتی ہوں۔ اس میں میری ٹریننگ جرنلسٹ کی بھی شامل ہے۔ جیسے آپ کو کوئی سنجیدہ مضمون لکھنا ہوتا ہے فرض کیجیے آپ کو سوئز کنال پر ایک مضمون لکھنا ہے تو سوئز کنال پہ لکھنے کے لیے پوری سوئز کنال کی تاریخ پڑھنی ہوگی۔ پھر مجھے بے حد شوق ہے ہسٹری کا۔ میری ساری اپروچ ہسٹری کی ہے۔ میرا پورا Concept تاریخ کا ہے۔ History is time اور Time is history پھر مجھے دلچسپی ٹائم سے ہے اور اس کے ساتھ Connection جا کے ملتا ہے Mysticism سے اس میں Historical Perspective بھی آتا ہے۔ Mysticism کا جو ایک Mystical Dimension ہے وہ ایک لمبا قصہ ہے اور جو تھوڑی بہت میری معلومات ہیں تین چار قسم کی، آرٹ ویسٹرن کلاسیکل میوزک وغیرہ کی ہے۔

افتخار:

آپ کے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے نقاد آپ کو اہم تو سمجھتے ہیں لیکن آپ کے ناولوں بالخصوص آپ کے افسانوں پر کچھ لکھتے ہوئے ہچکچاتے بھی ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ ہر نقاد کے یہاں تقریباً ایک جیسی بات ہی پائی جاتی ہے، ایسا کیوں ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دراصل ہمارے یہاں کاٹا اور لے دوڑے والی بات زیادہ ہوتی ہے یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ جیسے میں نے ابھی ایک ناول لکھا "آخر شب کے ہم سفر" جس کے کچھ حصے آپ نے رسالہ گفتگو میں پڑھے ہوں گے، اس میں، میں نے بنگال کو پیش کیا ہے۔ بنگال سے مجھے واقفیت ہے۔ جس چیز سے مجھے واقفیت ہے اسی کے بارے میں لکھوں گی۔ جیسے مجھ سے سوال کیا گیا کہ آپ اپر کلاس کے بارے میں لکھتی ہیں، دیہات یا مزدور طبقے کے بارے میں کیوں نہیں لکھتی ہیں؟ آپ اگر یہ کہیں کہ کچھ میمنوں کے بارے میں لکھئے اور اگر میں ان کے متعلق جانتی ہوں تو میں ان کے متعلق ضرور لکھوں گی اب اگر میں کسی چیز کے بارے میں نہیں جانتی تو کیسے اس کے بارے میں لکھوں۔ لیکن آپ نے میرا وہ ناول پڑھا ہے "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو"۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ مجھ پر اس طرح کا اعتراض نہیں کر سکتے کہ میں نے ہر طبقے کے متعلق نہیں لکھا۔ اچھا کیا یہ ناول "اگلے جنم......؟" لگتا ہے کہ کسی آؤٹ سائیڈر نے لکھا ہے؟ کیا ایسا لگتا ہے؟

افتخار:

جی نہیں، ایسا نہیں لگتا!

قرۃ العین حیدر:

ہاں تو بات چل رہی تھی نقاد، ناول اور افسانوں کی۔ میرے افسانوں میں بہت کافی ورائٹی ہے اور اس طرف کسی نقاد نے توجہ نہیں دی۔ میرے مختلف افسانوں کی جو بیک گراؤنڈ ہے وہ کہیں غیلا کی ہے کہیں جاپان کی، کہیں ایران کی، جہاں کہیں میں گئی ہوں، جہاں جہاں میں رہیں ہوں اور جن چیزوں نے مجھے انسپائر کیا ہے میں نے لکھا اور نقادوں نے ان کو سنجیدگی سے پڑھا نہیں ہے۔ اگر کسی نقاد نے 1951 میں میری کوئی تخلیق پڑھ لی تھی تو آج تک اُسی چیز کے متعلق اور اسی نظریے سے لکھے کو دہرایا جائے گا۔ کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوگی کہ ذرا آگے بھی پڑھ لیں۔ پھر پہلے جس نقاد نے جو بات کہہ دی...... دوسرے بھی وہی دہرائے جائیں گے اور دُہراتے رہیں گے۔ یہ مشکل ہے۔ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

افتخار:

''آگ کا دریا'' پر میرا ایک آخری سوال اور ہے اور محمد احسن فاروقی نے بھی یہی لکھا ہے کہ آگ کا دریا فکشن کے لحاظ سے بہت یک طرفہ ہے کیونکہ اس میں کردار نگاری اسٹیریو ٹائپ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اب میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ محمد احسن فاروقی کا یہ خیال تھا تو ٹھیک ہے۔ اُن کا خیال تھا۔ وہ بے چارے مرحوم ہو گئے۔ اب ان کے متعلق بحث مناسب نہیں۔ ویسے ''آگ کا دریا'' پر جو کچھ لکھا یا جتنا کچھ کہا گیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل ہمارے یہاں ناول ہی نہیں ہیں۔ میں نے یہ بات ایک سیمینار میں کہہ دی تھی۔ لوگ خفا ہو گئے۔ ہمارے اُردو ادب کا مزاج بنیادی طور پر یا تو شاعری کا ہے یا پھر افسانے کا۔

افتخار:

اگر ناول نہیں ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ناول اس لیے نہیں ہے کہ ادیبوں کو لکھنے کے لیے جو مالی فراغت چاہیے یا جو سکون چاہیے وہ یہاں نہیں ہے۔ اب آپ تو جانتے ہیں کہ ویسٹ میں کیا ہوتا ہے؟ ایک ناول نگار ناول کی تخلیق کے لیے کسی بھی پُر سکون جگہ پر جا کر رہتا ہے۔ ایک سال تک تو ریسرچ کرتا ہے۔ تین چار اس کے سکریٹری ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کسی سکریٹری سے کہتا ہے کہ میں اپنے ناول کے ایک سین کے لیے سوئزرلینڈ کے فلاں گاؤں کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں، تم جا کے وہاں کا ماحول دیکھ کر آؤ پھر میں جاؤں گا۔ جاپان میں بھی یہی ہوتا ہے۔ میں جاپان گئی تو وہاں بھی میں نے یہی دیکھا۔ بڑے ناول نگار دُور دراز پہاڑی مقامات پر رہتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ انھیں لاکھوں روپے رائلٹی ملتی ہے۔ ان کے ہر ناول کو لاکھوں کی تعداد میں پڑھنے والے ہیں۔ آپ کے یہاں ایک ناول آپ کا شایع ہوا۔ ایک ہزار کی تعداد میں۔ اس کو دو ہزار آدمیوں نے پڑھ لیا۔ اس پر چار

نقادوں نے لکھا تین چار نے اسے اگنور کیا۔ کچھ اس کے خلاف کچھ اس کی موافقت میں۔ ادب ہمارے یہاں بے حد سمٹا ہوا ہے کیونکہ ہمارے یہاں ادب کے قارئین نہیں ہیں، اُردو کے پڑھنے والے نہیں ہیں، آپ لکھیں کس کے لیے۔ چھاپنے والے نہیں ہیں۔ کون ناول لکھے گا۔ کون چھپوائے گا اور کون پڑھے گا۔ ٹھیک ہے کچھ لوگ لکھ رہے ہیں شوق ہے تھوڑا بہت لکھ لیتے ہیں پڑھ لیتے ہیں۔ کام ہو رہا ہے تھوڑا بہت لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ ادب کا دریا بہہ رہا ہے، ناول لکھے جا رہے ہیں تو یہ سب بے کار ہے۔ یہاں تو Cult بنے ہوئے ہیں۔ ایک کلٹ الٰہ آباد میں ہے، ایک کلٹ پٹنہ میں ہے۔ جگہ جگہ گروپ ہیں۔ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ دلی میں ایک گروپ ہے، علی گڑھ میں ایک گروپ ہے، ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ بقراط میں ہی ہوں...... آپس میں لڑ رہے ہیں۔ یہ ادب ہے؟ پاکستان کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں۔ وہاں یہ ہے کہ اُردو سرکاری زبان ہے۔ لہٰذا زیادہ بڑے پیمانے پر یہ سب خرافات موجود ہیں۔

افتخار:

اُردو ناول کی جو بھی عمر رہی ہو ہندستان یا پاکستان میں اس کے احاطے میں پھر بھی ناولوں کی ایک بھیڑ سی نظر آتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ سنجیدہ ناول چند ایک ہی ہیں۔ لیکن ناولوں کی بھیڑ کو، جسے آپ پاپولر ناول کہہ لیں، کس خانہ میں جگہ دیں گی یا کس بنیاد پر اس پوری بھیڑ کو رد کر دیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں دیکھا جائے تو ناولوں کی ایک بھیڑ سی لگی ہے۔ پچھلے پچھتر سالوں سے تو خواتین بھی ناول لکھ رہی ہیں۔ مرد بھی ناول تخلیق کر رہے ہیں۔ لیکن ناول کا مطلب ہے ایک باقاعدہ ناول جس کی کوئی ادبی حیثیت ہو۔ ایسے ناول ہمارے ہاں کم ہیں۔

افتخار:

مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کو بیسویں صدی کی ناول نگاری میں ایک روشن چراغ کی حیثیت دی جاتی ہے جس میں سارے اہم رجحانات مکمل فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ

شامل ہیں لیکن قاری سرفراز حسین عزمی کی ''شاہد رعنا'' کو فراموش کر دیا جاتا ہے جبکہ دونوں ناولوں میں بہت زیادہ مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

آپ نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح ہے۔ میں نے ''کار جہاں دراز ہے'' (جلد اوّل) میں اس بات کو پوائنٹ آؤٹ کیا ہے کہ رسوا کا ناول تقریباً چربہ ہے ''شاہد رعنا'' کا جو ''امراؤ جان ادا'' سے قبل لکھا گیا ہے۔۔۔۔۔۔لیکن دیکھیے نا ہمارے یہاں اُردو ادب یا اُردو تنقید کی عجیب روایت ہے، عجیب و غریب ظلم ہے کہ ''شاہد رعنا'' کا کہیں ذکر نہیں ہوتا۔ ''شاہد رعنا'' میں نے اب دوبارہ پڑھی۔ بالکل وہی طوائف ہے، وہی ماحول ہے، وہ سب کچھ ہے، کوئی زیادہ فرق نہیں امراؤ جان ادا اور شاہد رعنا میں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک دلّی کی ہے تو دوسری لکھنؤ کی۔ گو دونوں ناول پرانی تکنیک کے ہیں۔ لیکن رسوا کا امراؤ جان ادا، بہتر ناول ہے۔ امراؤ جان ادا سچ مچ موجود تھیں۔

انور قمر:

یہ ایک قطعی روایتی سوال ہے کہ ہر تخلیق کا۔۔۔۔۔۔

قرۃ العین حیدر:

کہ آپ کیوں لکھتی ہیں؟

انور قمر:

نہیں یہ بات نہیں!

قرۃ العین حیدر:

کہ آپ کو کس نے متاثر کیا۔

انور قمر:

لکھنے سے پیش تر اور لکھنے کے دوران آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے اور یہ بھی بتائیے کہ لکھنے کے لیے آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی یہ کیا بے کار بات ہے۔ کیا کوئی دورہ پڑتا ہے، یا کیا ہوتا ہے۔ دراصل ہمارے یہاں شعرا حضرات نے کچھ ایسی ہوا باندھ دی ہے کہ الہام ہوتا ہے۔ وحی آتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں۔

یونس:

بات یہ ہے کہ شعرا اور ادبا کو کچھ الگ ہی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کی ایک ایک حرکت، ایک ایک ادا پُر اسراری لگتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

خیر۔ خیر ہوتا ہوگا ایسا کچھ۔ میں یہ سب کچھ نہیں مانتی۔ کوئی اور سوال کیجیے۔

افتخار:

کیا ہر ناول نگار کو ناول کا نقاد بھی ہونا چاہیے جیسا کہ فیلڈنگ سے لیکر جیمس جوائس تک اور اس کے بعد تقریباً سب ہی نے ناول کے فن پر تنقید لکھی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے میں اپنے آپ کو بذاتِ خود نقاد تو نہیں کہوں گی لیکن میں نے انگریزی میں تنقید لکھی ہے۔ میں نے انگریزی ادب پر مضامین لکھے ہیں ریویو کیے ہیں، بہت کچھ لکھا ہے، یہاں بھی، لندن میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ مجھے کوئی انکسار نہیں اپنے بارے میں اور نہ ہی میں خود غلط ہوں۔ میرے خیال میں ناول نگار کو ناول کا نقاد ہونا چاہیے ناول نگاری ایک سیریس کرافٹ ہے۔ لکھنا مذاق نہیں ہے۔ اگر آپ سنجیدگی سے لکھ رہے ہیں، اگر آپ توقع کریں گے کہ لوگ آپ کو پڑھیں تو اس کے لیے خود آپ کو سنجیدہ ہونا چاہیے۔ خود اپنی تخلیق کی اچھائی بُرائی سے آگاہ ہونا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کیا لکھ رہے ہیں، کیوں لکھ رہے ہیں، اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس کی کیا معنویت ہے۔

افتخار:

آپ نے اُردو میں کیوں تنقید نگاری نہیں کی؟

قرۃ العین حیدر:

کیوں؟ کیا میرا دماغ خراب ہوا ہے۔ میں کریئیٹو رائٹر ہوں۔

افتخار:

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا کہ یورپ میں جتنے بڑے ناول نگار ہیں سبھوں نے فن ناول نگاری پر تنقید کی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جب تک ناول نگار اس فن کا اچھا ناقد نہیں ہوگا اُس وقت تک وہ دوسروں پر واضح نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے فن کے ذریعے سے یا اپنے ناول کے ذریعے سے کیا بات کہنا چاہتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھئے۔ لکھنے کے بارے میں یہ ہے کہ جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو یہ بالکل آمد ہوتی ہے۔ اس وقت ہم یہ نہیں سوچتے کہ اس کی یہ تکنیک ہوگی، اس کو ہم یوں بنائیں گے، یوں لکھیں گے۔ فلاں کو پہلے پڑھیں گے اس نے یہ لکھا تھا۔ انسان اگر کریٹو ہے تو وہ یہ سب نہیں سوچتا۔ لکھنے کے بعد نظر ثانی کے وقت وہ سوچتا ہے کہ کہاں کیا تبدیلی کرنی چاہیے یا دوبارہ لکھنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ میں ناول کے فن پر تنقید لکھوں تو یہ ایک بوریت کا کام ہے۔ اسے میں کیوں کروں میں بقراط کیوں بنوں؟

انور قمر:

انتظار حسین اور آپ میں ایک قدر مشترک ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ناسٹلجیا Nostalgia؟

انور قمر:

نہیں! داستانوی انداز بیان ''کارِ جہاں دراز ہے'' کے دوران جو یادداشت اور مسودات آپ کو ملے تو کیا آپ نے اس میں سے کچھ اخذ کیا ہے یا جوں کا توں اس کو پیش کر دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

خاص طور پر تو ایسا نہیں کیا۔ میرے پاس جو بیک گراؤنڈ میٹریل تھا پرانے مسودات،

پرانی کتابیں، میں نے سوچا تھا کہ اتنا بڑا اس کا کینوس ہے تو ہر پیریڈ کے بارے میں جب میں لکھوں گی تو اسی پیریڈ کی زبان میں لکھوں گی۔ اُسی پیریڈ کے اسٹائل میں لکھوں گی...... لہٰذا انیسویں صدی کے ایک بزرگ بندے علی جو زبان استعمال کر رہے ہیں وہ اپنے عہد کی زبان بول رہے ہیں۔ صوفیا کے ملفوظات میں جو زبان ہوتی تھی وہ استعمال کی Late Nineteenth Century میں جو وکٹورین ناول تھے، شرر وغیرہ اُردو میں لکھتے تھے جس طرح کے ناول، وہ اسٹائل آگے چل کر Contemporary زبان استعمال کی۔

افتخار:

''کارِ جہاں دراز ہے'' اُردو میں سوانحی ناول کی ایک اہم بنیاد ہے۔ جو تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے بھی ایک اہم اضافہ ہے۔ لیکن واقعات و حالات کی کڑیاں مربوط نہیں جس وجہ سے قاری کو کئی اُلجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کیا اس ناول کی ترتیب میں کسی خاص خیال یا نکتے کو ملحوظ رکھا گیا ہے یا پھر یادداشتوں کو محض کڑیوں میں پرو دیا گیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میرا تو خیال تھا کہ کڑیاں مربوط ہیں۔ میں نے کوشش تو یہی کی کہ میں انھیں مربوط رکھوں۔ شروع میں نے کیا اسی ملفوظات والے اسٹائل میں۔ میں نے جہاں سے ناول شروع کیا ہے اس کا تسلسل 19ویں صدی تک آتا ہے۔ چونکہ پڑھنے والے کی میری اس مخصوص تناظر سے اتنی واقفیت نہیں ہے لہٰذا ایسا لگتا ہوگا۔ اب چونکہ میں تو خود اس میں Involve تھی لہٰذا میرے لیے تسلسل برقرار ہے۔ لیکن میں نے کوشش کی ایک نئی چیز لکھنے کی ایک Socialogical تصویر پیش کرنے کی پوری ایک تہذیب کی۔ اس کے ساتھ Historical بھی۔ مغربی یوپی کا ایک نمائندہ خاندان لے کر یہ ہر خاندان کی کہانی ہے۔

افتخار:

اس سوانحی ناول کو آپ نے فیملی ساگا بھی کہا ہے۔ مغرب میں فیملی پر زوال آ گیا ہے، فیملی ٹوٹ رہی ہے وہاں اس فن کو کافی برتا گیا ہے لیکن ہمارے یہاں ابھی تک یہ فن عام بھی نہیں

ہوااور کہیں نظر بھی نہیں آتا۔

قرۃ العین حیدر:

انگلینڈ میں تو فیملی ساگا سب سے زیادہ بک رہے ہیں۔ ہمارے یہاں اس پر توجہ ہی نہیں دی گئی۔

افتخار:

کار جہاں دراز ہے کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ناول ہی نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ناول کی تعریف کیا ہے؟ کیا مجھے اس کتاب کو تاریخی داستان کہنا چاہیے۔ ناول اور فکشن دو مختلف چیزیں ہیں۔

انور قمر:

Reality سے ذرا اوپر۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں Reality نہیں بلکہ Non-Reality۔

یونس:

ناول کو بھی تو فکشن میں شامل کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

لیکن ہر ناول کا فکشن ہونا ضروری نہیں۔ Biographical ناول ہوتا ہے، Auto Biographical ناول ہوتا ہے۔ Biographical ناولوں میں یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے کو اسی حیثیت سے ظاہر کریں جو آپ ہیں کسی اور روپ میں نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ Semi Biographical ہوگا یعنی آپ اپنے آپ کو کچھ اور بنا کر پیش کریں۔ کار جہاں دراز ہے کی جلد دو میں آپ پاکستان کے متعلق پڑھئے گا۔ پاکستان کا جو ہمارا ماحول تھا ہمارے دوست تھے، ہمارے رشتے دار تھے. Third volume will be about India.

یونس:

آپ کے یہاں اس ناول میں بنیادی چیزیں اشخاص نہیں ہیں بلکہ تہذیب ہے۔

قرۃ العین حیدر:

دونوں چیزیں ہیں۔ اشخاص تہذیب بناتے ہیں۔ تہذیب اشخاص بناتی ہے اور یہ دونوں چیزیں الگ الگ تو نہیں یہ تو ایک سلسلہ ہے۔

افتخار:

کہتے ہیں کہ ناول اپنی وسیع ترین تعریف میں زندگی کا شخصی اور راست اثر ہے اور آپ نے اب تک جتنے بھی ناول لکھے خاص طور شعور کی رو کی تکنیک والے ناول جس میں آزاد تلازمۂ خیال کے تحت داخلی احساسات وجذبات کی پیش کش میں ناول نگار خود غالب ہو جاتا ہے۔ مجھے آپ کے تمام ناولوں میں ایک ایسا مستقل بہاؤ ملتا ہے جسے اگر میں وسیع ترین ذاتی غم کہہ لوں تو زیادہ بہتر ہو سکتا ہے اور یہ غم آپ کے پورے وجود میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ میں نے آپ کے ناولوں میں ایسی فضا پھیلی ہوئی پائی ہے، چاہے آپ کے ناول کسی بھی موضوع پر ہوں لیکن عمیق تجزیہ کسی بنیادی المیہ کی نشاندہی کرتا ہے چاہے وہ آگ کا دریا ہو، چائے کے باغ ہو، سفینۂ غم دل ہو۔

قرۃ العین حیدر:

ہو سکتا ہے کہ زندگی کی بنیادی اُداسی کا آپ احساس کرتے ہیں میرے یہاں، یاسیت کو پاتے ہوں۔ میں نے ہمیشہ Human Condition اور ٹوٹتی ہوئی تہذیبوں کا المیہ پیش کیا ہے ''کارِ جہاں دراز ہے'' بھی اس کی ایک مثال ہے۔

افتخار:

یہ المیہ تو ''آگ کا دریا'' میں بھی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یعنی ہمارا المیہ پورے وقت کا المیہ ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جو سب کا ہے۔

کہ Creative Writers کا ہے۔ Who is involved in the process of creation زندگی بہت آگے بڑھ رہی ہے اور وقت کا المیہ یہ ہے کہ وقت گزرتا چلا جارہا ہے۔ لیکن میں قنوطی قطعی نہیں۔

افتخار:

ہوسکتا ہے کہ آپ اسے نہ محسوس کرتی ہوں اور یہ سب کچھ لاشعوری طور پر ہوا ہو۔

قرۃ العین حیدر:

بڑے تعجب کی بات ہے کہ میرے ناولوں میں آپ کو اتنی اُداسی نظر آتی ہے۔

افتخار:

جی ہاں! آگ کا دریا، سفینۂ غم دل، کار جہاں دراز ہے، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو، میرے بھی صنم خانے یا کوئی ایک افسانے میری بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

پھر وہی تاریخ کی بات آجاتی ہے، مجھے علم آثار قدیمہ سے بے حد دلچسپی ہے۔ I am intensely interested in the past.

یونس:

ان کھنڈروں کو دیکھ کر آپ کو افسوس ہوتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کھنڈر آپ کو ماضی میں لے جاتے ہیں۔!! میرا ذاتی ماضی نہیں یا صرف میرے خاندان کا ماضی نہیں بلکہ مجھے پورے ماضی سے دلچسپی ہے۔ میں تاریخ میں ماضی میں Involved ہوں بہت زیادہ۔ اگر مجھے موقع ملے تو میں موہن جوداڑو کے بارے میں لکھوں۔ I would like to go back and back and back جتنا بھی دور جاسکوں۔ میں نے ایک کہانی لکھی تھی ''روشنی کی رفتار'' جس میں ایک لڑکی ٹائم مشین میں بیٹھ کر تیرھویں صدی قبل مسیح میں چلی جاتی ہے۔ I am involved in time and time makes you sad لیکن یہ اُداسی خالص ذہنی ہے جو

Human situation کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور غالباً ہر حساس انسان میں پیدا ہوگی۔ میرے اندر غالباً یہ ثنویت موجود ہے کہ میں ذاتی طور پر نہایت بشاش اور شاد ماں Cheerful انسان ہوں اور زندگی اور دنیا اور Situations سے خوب خوب محظوظ ہوتی ہوں۔ اور ایک مسرت پسند انسان ہوں۔ یعنی مجھے کسی طرح بھی یاسیت پرست نہیں کہا جاسکتا۔

افتخار:

آپ کے خیال میں افسانے کی کیا تعریف ہوسکتی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

افسانہ، افسانہ ہے، افسانہ اچھا بھی ہوسکتا ہے، بُرا بھی ہوسکتا ہے..... میرے نزدیک معیار یہ ہے کہ وہ اچھا ہو ہر لحاظ سے:

As a Human Documents.

As a piece of Literature.

And as some Thing to enjoy.

And as something which Disturbs you.

Some thing which stimulates you.

اور یہی سب کچھ افسانے کو ادب کا ایک حصہ بناتی ہیں۔ اب دیکھیے شیکسپیئر، شیکسپیئر کے کسی بھی پلے کی کوئی بھی پانچ لائنیں لے لیجیے وہ ہم عصر ہیں لیکن ظاہر ہے ایک شیکسپیئر پیدا ہوا تھا دوسرا نہیں ہوگا، اقبال ایک پیدا ہوا تھا، دوسرا نہیں ہوگا۔

افتخار:

اب تک آپ نے کتنے ناول لکھے ہیں یکے بعد دیگرے؟

قرۃ العین حیدر:

میرے بھی صنم خانے، 1949، سفینۂ غم دل 1954۔ آگ کا دریا 1959 میں اس کے بعد 'آخرِ شب کے ہم سفر' شائع ہوا ہوگا 1978 میں۔ مجھے اپنا یہ ناول بے حد پسند ہے It is my best novel and i am quite exited about it. چائے کے باغ، سیتاہرن، دلربا۔ اگلے جنم

موہے بٹیانہ کیجو، ہاؤسنگ سوسائٹی یہ سب میرے ناولٹ ہیں اور افسانے ہیں کوئی پچاس ساٹھ۔ رپورتاژ لکھے ہیں......''ستمبر کا چاند'' شاید آپ نے نہیں پڑھا۔ یہ میں نے جاپان اور مشرق بعید کے بارے میں لکھا۔ میں نے ڈھیروں رپورتاژ لکھے ہیں۔ میری بہت سی چیزیں ہندستان میں شایع نہیں ہوئی ہیں وہاں پاکستان میں شایع ہوئی ہیں۔ دونوں جگہ میری کتابیں عموماً چور پبلشر شایع کرتے ہیں۔

یونس:

اگر آپ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ مرتب کرنا چاہیں جن میں دس یا بارہ بہترین اور منتخب کہانیاں ہوں تو آپ کون کون سی کہانیوں کا انتخاب کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

یہ مشکل ہے اور بیٹھ کے دیکھنا پڑے گا ان کہانیوں کو لیکن میری ادھر جو چار پانچ کہانیاں شایع ہوئی ہیں جیسے ملفوظات حاجی گل بابا بیگ تاشی، یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے اور کوئی سات آٹھ کہانیاں اس سے قبل کی اور دو تین کہانیاں۔ اس طرح ایک بہتر انتخاب ہوسکتا ہے۔ اب آخر میں آپ سے ایک بات اور کہہ دوں کہ اپنے متعلق اس قسم کے انٹرویوز وغیرہ مجھے ہمیشہ بہت عجیب لگتے ہیں کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے کہا تھا میری ساری ٹریننگ جرنلسٹ اور پبلک ریلیشنز کے کام کی اور براڈ کاسٹنگ کی ہے اور میں نے اَن گنت لوگوں کو اس برصغیر میں اور باہر انٹرویو کیا ہے یا ان کے متعلق لکھا ہے۔ لہٰذا خود مجھے جب انٹرویو کیا جاتا ہے تو مجھے بڑی سخت جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ اس جھنجھلاہٹ کو آپ غالباً نہیں سمجھ سکتے کیونکہ اس وقت خود میرا رول یہ ایک Seasoned جرنلسٹ کا ہوتا ہے جو ان سب Tricks of the trade کو پہچانتا ہے۔

(شاعر، بمبئی، شمارہ-7، 1978)

کچھ ناقدین کو زعم ہے کہ وہ ادب کے کنگ میکر ہیں

گفتگو : شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی:

آپ کی تخلیق پر کوئی نقاد اظہار خیال کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ نقاد سے کیا توقع کریں گے؟

(الف) نقاد آپ کی تخلیق پر فیصلہ جاتی انداز میں اظہار رائے کرے، یعنی یہ بتائے کہ تخلیق اچھی ہے یا بُری ہے اور اچھی یا بُری ہونے کی وجہ بھی بیان کرے۔

(ب) نقاد آپ کی تخلیق کی تشریح و تفسیر کرے۔ تخلیق کے اچھی یا بُری ہونے کا فیصلہ اس قاری کا ہو جو آپ کی تخلیق کو نقاد کی تشریح و تفسیر کی روشنی میں پڑھتا ہے۔

(ج) نقاد آپ کی تخلیق کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرے بلکہ وہ محض اس ذہنی کیفیت اور جذباتی ردِّ عمل کا بیان کرے جو اس تخلیق کے ذریعے اس کے اوپر مرتب ہوئے ہوں۔

(د) نقاد فیصلہ دے، نہ تشریح کرے، نہ اپنے تاثرات بیان کرے، بلکہ آپ کی تخلیق کا سچا اور ایماندارانہ بیان تحریر کرے۔

پہلے طریقہ کار کو EVALUATIVE دوسرے کو INTERPRETIVE تیسرے کو APPRECIATIVE چوتھے کو DESCRIPTIVE کہا جاسکتا ہے۔ ......آپ کے خیال میں آپ کے نقاد کا صحیح منصب ان چاروں میں سے کس طرح کی تنقید لکھنے کا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نقاد اگر سمجھ دار اور محنتی ہے تو وہ چاروں طریقے استعمال کرے گا لیکن (الف) کے علاوہ کیا باقی تین طریقوں میں سچائی اور ایمان داری نہیں برتی جاتی۔ معاف کیجیے گا۔ آپ کے سوالات نظریاتی اور ٹیکنیکل قسم کے ہیں اور یہ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادیب سے کیے جاسکتے ہیں۔ میں اُردو میں لکھتی ہوں اور آپ بھی اسی زبان کے نقاد ہیں لہٰذا میں لامحالہ آپ کے سوالات کے جواب اپنے تجربے اور اُردو کے ادبی ماحول کی روشنی میں دوں گی۔

آپ نے ان چار طریقوں کے علاوہ پانچویں کا ذکر نہیں کیا جسے مصلحتی تنقید کہا جاسکتا ہے اور جو ذاتی تعلقات ذاتی پرخاش ادبی سیاست اور دیگر اغراض و مقاصد کی بنا پر لکھی جاتی ہے اور اُردو میں کافی رائج ہے اس نوجوان ادیب اور شاعر کا حالیہ واقعہ عبرت پکڑنے کے لیے کافی ہے کہ جب وہ مالی لحاظ سے صفر تھا تو اس کی تخلیقات پر کسی نے کچھ نہ لکھا مگر جب وہ کروڑ پتی وغیرہ بنا تو اسے ایلیٹ اور حافظ اور مولانا روم سے برتر ثابت کیا گیا (اس کے متعلق ایک قصیدہ شب خون میں بھی چھپا تھا)۔ یا اگر یہ طے کرلیا جائے کہ فلاں افسانہ نگار کو PROMOTE کرنا ہے تو اس کے ایک بے حد معمولی افسانے کے پانچ پانچ ''تجزیاتی مطالعے'' ایک ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ مثال کے طور پر یہاں بانو قدسیہ جیسی غیر معمولی اور بلند پایہ افسانہ نگار کا کہیں نام تک نہیں لیا جاتا۔ (یہ میرا فیصلہ جاتی بیان ہے) یا مثلاً میں ایک کتاب لکھتی ہوں ایک مشہور نقاد جو ایک رسالہ بھی شائع کرتے ہیں اور ایک مشہور نقاد سے اُس کے خلاف طویل مضمون لکھواتے ہیں تا کہ ان کا چرچا ہو CONTROVERSY کی صورت نکلے اور ان کا رسالہ زیادہ بکے۔

اس صورت حال میں دانشور نقادوں کی CREDIBILITY ایک ادیب یا ایک عام قاری کے لیے کتنی رہ گئی ہے اور اس صورتحال میں آپ کے سوالات ذرا غیر ضروری سے معلوم

ہو رہے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

کیا آپ اپنے نقاد کے لیے یہ مناسب سمجھیں گے کہ وہ آپ کی تخلیق میں ایسے معانی و مفاہیم تلاش کرے جو آپ کے عندیے (INTENTION) میں نہ ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے بھی کہ نقاد آپ کے عندیے تک بلاشک وشبہ پہنچ سکے۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ کے نزدیک علامت اور استعارے کا تفاعل کیا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے کہ علامت اور استعارہ معانی کو روشن یا وسیع تو کرتے ہیں لیکن فنکار کے عندیے کو مبہم بھی کر دیتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

آج کل ایک جناتی قسم کی تنقید لکھی جا رہی ہے (مثال: مہدی جعفر) جس میں (الف) کچھ پلّے نہیں پڑتا ہے کہ مضمون نگار کہنا کیا چاہتا ہے (ب) ایسے مفاہیم تلاش کر لیے جاتے ہیں جو لکھنے والے کے عندیے میں نہیں تھے اور نہ کسی علامت اور استعارے سے اس کا اشارہ ملتا تھا۔ ایک بار بیدی صاحب نے شاید 'ایک باپ بکاؤ ہے'' کے لیے مجھ سے کہا تھا کہ یار لوگوں نے اس میں اسطوری اور جانے کیا کیا نکتے ڈھونڈھ نکالے ہیں جو ان کے ذہن میں نہیں تھے۔

اس کے برعکس میرا ذاتی مسئلہ یہ ہے کہ سوائے ''آگ کا دریا'' (جس کی بال کی کھال نکالی جا چکی ہے) میری تحریروں کے استعارے، علائم اور تلمیحات کو اکثر نقادوں نے قطعاً نظر انداز کیا ہے یا غلط مطالب اخذ کیے ہیں۔ مثلاً مراد آباد کے فساد کے متعلق افسانے ''دریں گرد سوارے باشد'' ایک خاصے مشہور ناقد کو ''مسلمانوں کی نئی زر پرستی'' کے متعلق افسانہ نظر آیا۔

ظاہر ہے کہ علامت و استعارے کا تفاعل وہی ہے جو ہونا چاہیے۔ آج کل یا بے حد مبتذیانہ اور OBVIOUS قسم کے علامتی افسانے لکھے جا رہے ہیں یا بے حد مبہم۔ استعارہ اتنا مبہم نہ ہونا چاہیے کہ بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ ورنہ ایک SANE تخلیق اور پاگلوں کی لکھی ہوئی تحریروں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ مغرب کے پاگل خانے اپنے ذہنی مریضوں کے لکھے ہوئے افسانے نظمیں اور ان کی بنائی ہوئی تصویر شائع کرتے ہیں جو اکثر نہایت فکر انگیز اور مضطرب کرنے والی

ہوتی ہیں۔ مگر وہ صحیح الدماغی کا ادب یا آرٹ نہیں۔

ذاتی طور پر میں ضرور ایک صاحب نظر نقاد سے یہ توقع رکھوں گی کہ وہ میری SECRET LANGUAGE کو سمجھ لے اور اس کی تفسیر و تشریح کر سکے۔ لیکن جب تخلیق کار اور ناقد کے درمیان ہی کیمونی کیشن نہیں تو یہ قصور کس کا ہے؟ ناقد کو بلاشک وشبہ میرے عندیے تک پہنچنا چاہیے۔ اگر وہ نہ سمجھ سکے تو اس کا برملا اظہار ہونا چاہیے۔ بغیر سمجھے بوجھے اپنی رائے دینا میرے نزدیک نقاد کا صحیح منصب نہیں ہے۔ علامت اور استعارے معانی کی توسیع ضرور کرتے ہیں لیکن فن کار کے عندیے کو مبہم اس وقت کرتے ہیں جب فن کار چاہے کہ فنی یا کسی اور مقصد سے وہ عندیہ مبہم رہے مجھ سے اکثر طنزاً کہا جاتا ہے کہ آپ کی تحریروں پر لکھنے کے لیے تو بہت سے علوم سے واقف ہونا چاہیے۔ یہ بالکل مہمل بات ہے اگر ناقدین نے اپنے آپ کو ادب کا پارکھ مان کر اپنی گدیاں سنبھالی ہیں تو یقیناً ان کو بہت سی پوتھیاں باچنی چاہئیں۔ ادب اکہری چیز نہیں ہے۔

فن کار چاہتا تو ہے کہ علائم کے ذریعے معانی روشن ہوں اور وہ دھندلے ہو جاتے ہیں تو یہ لکھنے والے کی اپنی کمزوری ہے۔ بڑے فن کاروں کا ابہام ان کی طاقت ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کا ہر قاری تاریک انگلستان یا اینگلو کیتھولک چرچ کی LITURGY سے واقف نہیں یا اٹس کو ایزرس اساطیر جانے بغیر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ یعنی اس کے الفاظ کے ظاہری، یونیورسل، اندرونی معانی بھی گرفت میں آسکتے ہیں۔ لیکن ابہام برائے ابہام جو پچھلے دنوں اُردو میں رائج تھا لایعنی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

کیا آپ کا نقاد اس بات میں حق بجانب ہوگا کہ وہ آپ کی تخلیق پر اظہار خیال کرتے وقت آپ کی ذاتی زندگی کے واقعات اور آپ کی ذاتی رایوں اور پسند اور ناپسند کو بھی اپنے فیصلے یا تجربے یا تاثر بیان کی دلیل میں لائے؟

قرۃ العین حیدر:

تنقید لکھتے وقت فن کار کی ذاتی زندگی، رائیں، پسند ناپسند وغیرہ کے متعلق شعوری یا غیر شعوری طور پر نقاد کے ذہن میں عموماً پہلے سے علم موجود رہتا ہے۔ بالکل نئے لکھنے والوں کے علاوہ

مشہور اہل قلم کے متعلق سب کو اتنا معلوم ہے کہ اس کا اثر ناقد کی رائے پر پڑنا ناگزیر ہے۔ میں نے آج تک میراجی کے متعلق کوئی مضمون ایسا نہیں پڑھا جس میں اس شاعر کی ابنارمل نفسیات کو۔ زیر بحث نہ لایا گیا ہو۔ کہا جاسکتا ہے کہ ژاں ژینے کی طرح میراجی اپنی ابنارملٹی کو CELEBRATE کرتے تھے۔ مگر مجاز، منٹو، ناصر کاظمی کی جو ہمیں زندگیاں اور ان کی شراب نوشی یا کرشن چندر و فیض کی اشتراکیت سے وابستگی ان پر تنقید کے فریم ورک میں ہمیشہ شامل رہتی ہیں۔ انتظار حسین اور ان کی ''ہجرت'' کی MISTIQUE لازم و ملزوم ہو چکے ہیں جب کوئی ''خوشیوں کے باغ'' پر لکھنے بیٹھا ہے تو اسے پہلے سے معلوم ہے کہ انور سجاد ایک سیاسی آدمی ہے اور اس نے ایک سیاسی استعاراتی ناول لکھا ہے۔ آپ کے TAINE کی تھیوری بھی تو یہی تھی کہ فن کار کی زندگی اس کی نسل قومیت سماجی پس منظر وغیرہ وغیرہ نقاد کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ اُردو میں خواتین کا معاملہ گویا ایک اور جہت کا اضافہ کرتا ہے۔ ہمارے فکشن پر بڑی حد تک خواتین غالب ہیں۔ تنقید مردوں کا اجارہ رہی ہے (سوائے ایک خاتون ممتاز شیریں مرحومہ کے) ناقدین کے رویے اکثر MALE CHAUVINISM کی غمازی بھی کرتے ہیں اور ایک عجیب سا رد یہ یہ ہے۔ مثلاً کشور ناہید کے نئے شعری مجموعے کے گرد پوش پر انور سجاد شاعری پر اظہار خیال کرنے کے بعد آخری جملہ یوں لکھتے ہیں۔ ''وہ پکوڑے بھی اچھے بناتی ہے۔'' یہ کیا بات ہوئی؟

شمس الرحمٰن فاروقی:

اگر فیصلہ کرنا نقاد کا کام نہیں ہے تو کیا یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ فن پارے کے بارے میں جو بھی اظہار خیال کیا جائے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک فیصلے کا عنصر بھی ہوگا۔ مثلاً یہی کہنا کہ ''گئودان کا مرکزی کردار ہوری ہے''۔ فیصلہ جاتی بیان ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے گئودان کے تمام کرداروں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کرداروں میں ہوری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے یا مثلاً یہی کہنا کہ ''اقبال کا مرثیہ داغ، میر انیس کے مرثیوں کی طرح کا نہیں ہے''۔ فیصلہ جاتی بیان ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مرثیوں کے قسمیں اپنے ذہن میں قائم کر چکے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ

CATEGORIES قائم کی جائیں۔ لہٰذا اگر ایسا ہے تو آپ یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کو فیصلہ جاتی ہونا چاہیے؟

قرۃ العین حیدر:

نقاد خالص معروضی تنقید بھی کر سکتا ہے اور فیصلے بھی (گو بعض ناقدین فتوے صادر کرتے ہیں) مگر اکثر اوقات فیصلے صادر کرنے والے آزاد نقاد اور مارکس وادی فیصلہ جاتی تنقید کرنے والے کے ادبی معیار میں شاید زیادہ فرق نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں "قومی تشخص، پر اصرار کرنے والے آج کے پاکستانی نقاد بھی تو ان دنوں CATEGORIES قائم کر کے ان کے مطابق ادب کی چھان پھٹک میں مصروف ہیں۔ کیا انھیں ناقدین کے زمرے میں شامل نہیں کیا جائے گا؟

شمس الرحمٰن فاروقی:

کیا نقاد کو اس بات کا حق ہے کہ وہ آپ کی تخلیق کو اس بنا پر مسترد کر دے کہ زندگی کے بارے میں جو رویہ یا کسی حقیقت کے بارے میں جو نظریہ آپ کی تخلیق میں ملتا ہے نقاد اس رویے یا نظریہ کو غلط سمجھتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نقاد یقیناً میری تخلیقات کو مسترد کر سکتا ہے جس طرح مجھے حق ہے کہ میں جو چاہوں اور جس طرح چاہوں لکھتی رہوں۔ اسی طرح نقاد کو حق حاصل ہے کہ وہ مجھے مسترد کر دے۔ ادب تو جناب عالی بالکل آزادی کا معاملہ ہے۔ لیکن مجھے علم نہیں کہ آج تک کسی لکھنے والے نے نقادوں کی دہشت میں لکھنا چھوڑ دیا ہو۔ دراصل اکثر ناقدین کے ہاں ان کے ذاتی یا نظریاتی تعصبات بھی کارفرما رہتے ہیں اور ان کے اپنے اپنے FADS ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اقبال کے قائل نہیں۔ وزیر آغا ہر جگہ کھینچ تان کر زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔ وارث علوی کا خیال ہے جب تک وہ ہر صفحے پر چند مغلظات استعمال نہ کر لیں گے ان کی بات میں وزن نہیں پیدا ہوگا۔

دراصل تخلیق کار اور نقاد کا معاملہ ان کی انانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ادیب یا شاعر سمجھتا

ہے کہ اس کی تخلیقات کی اساس پر ہی ناقد اپنی دکان چمکاتا ہے۔ کچھ ناقدوں کو زعم ہے کہ وہ گویا ادب کے KING MAKER ہیں۔ میں نے بہت سے مشہور اہلِ قلم کو مشہور ناقدین کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ ''فلاں فلاں کو ANTAGONISE مت کیجیے آپ کے خلاف لکھنا شروع کردیں گے۔'' کمال ہے۔

یوں تو شاید آپ کو یاد ہوگا ہی سارتر ناقدین کے بارے میں کیا کہہ گئے ہیں۔ شکریہ۔

(ماہنامہ 'چنگاری' دلّی، ستمبر 1983)

میں بنیادی طور پر رومانٹک ہوں

گفتگو : ابوالکلام قاسمی

ابوالکلام قاسمی:

ہمیں گفتگو کا آغاز یہاں سے کرنا چاہیے کہ آپ نے اپنے بعض مضامین اور انٹرویو میں یہ کہا ہے کہ آپ نے اپنے لکھنے کا آغاز خاصی کم عمری میں ہی کر دیا تھا اور یہ تو ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ آپ کے بالکل ابتدائی زمانے کے افسانے اس دور کے اہم ادبی رسائل میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تو ہم یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ اس زمانے کی، جب آپ نے لکھنا شروع کیا تھا ادبی صورتِ حال کیا تھی؟ اور آپ کو لکھنے کی تحریک کیوں کر ملی؟ ظاہر ہے کہ میری اس بات کا تعلق اس سے بھی ہے کہ آپ کی تربیت اور نشو نما جس ماحول میں ہوئی اس کا کتنا اثر آپ کی ادبی نگارشات پر پڑا۔

قرۃ العین حیدر:

تربیت، جس ماحول میں ہوئی اس کے بارے میں تو تقریباً سبھی کو معلوم ہے۔ اس کے بارے میں ہم کیا بتائیں۔ تربیت تو اچھی خاصی ہوئی تھی۔ (قہقہہ)

شہریار:

ایک تو یہ ہے کہ آپ کے والدین لکھتے تھے، عام طور سے دیکھا یہ گیا ہے کہ ادیبوں کے گھر میں بچوں کو DISCOURAGE کیا جاتا ہے اس چیز سے تو باقاعدہ آپ کے گھر والوں نے اُکسایا یا اس کے برخلاف کوئی رویہ اختیار کیا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، بالکل نہیں اُکسایا اور نہ گھر میں کوئی ایسا ماحول تھا جو اس سے روکے۔ ہمارے ہاں، گھر میں تو بہت شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ہماری کزنس وغیرہ شعر کہتی تھیں۔ ہماری پھپیاں فارسی میں شعر کہتی تھیں۔ پوری روایت تھی۔ آپ کو اس چیز کا پورا اندازہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ آپ کے بچے جس ماحول میں آج پل بڑھ رہے ہیں وہ مغربیت زدہ ہے۔ یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ بلکہ یہ IRONY ہے جبکہ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا اس وقت خاص طور سے میرا اپنا گھر بہت انگلسائیزڈ تھا، مگر اس کے باوجود ایک قسم کے دوراہے کا کلچر تھا۔ جس کا میں نے بہت ذکر کیا ہے۔ اس میں اُردو، فارسی پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ وہ تو انڈر اسٹوڈ بات تھی کہ بچوں کو اُردو آنی چاہیے۔ تلفظ صحیح کیا جاتا تھا۔ بیت بازی ہوا کرتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ انگریزیت بھی تھی۔ اب یہ ہے کہ مغربیت زیادہ ہے جو اُردو کا ماحول تھا وہ ختم سا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک چیز یہ تھی، مثال کے طور پر مجھ میں اور میرے ہم عمر کزنس میں یہ مقابلہ ہوا کرتا تھا کہ شکوہ اور جواب شکوہ پہلے کون یاد کرتا ہے۔ ہم سب چھوٹے بچے تھے۔ اس وقت، اب اس طرح آج کے بچے فلمی گانے یاد کرتے ہیں، یہ فرق تھا۔ تو اس ماحول میں اگر کوئی لکھتا تھا اور لکھنے کی گہما گہمی اتنی تھی کہ بچوں کے اخبار نکلتے تھے۔ پھول، پیام تعلیم، بنات وغیرہ پھول، تو گویا ہمارے گھر ہی کا رسالہ تھا۔ میری والدہ بنت نذر الباقر کی حیثیت سے اس کی ایڈیٹر رہ چکی تھیں۔ اس میں ہم نے بچپن سے لکھنا شروع کیا۔ لکھنا IT CAME NATURALLY TO ME اس میں انکریج کرنے یا ڈسکریج کرنے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔

ابوالکلام قاسمی:

اچھا! یہ تو ہے بچوں کے رسالوں کی بات۔ جب آپ نے باقاعدہ ادبی رسائل میں

چھپنا شروع کیا۔ تو ان دونوں کے درمیان غیر معمولی تبدیلی یا ایک بڑی جست کا انداز کیسے پیدا ہوا۔

قرۃ العین حیدر:

وہ بڑا GRADUAL TRANSITION یعنی اس طرح ہے کہ میں نے 'پھول' میں لکھا ہے۔ 1938 میں میری پہلی کہانی چھپی تھی۔ بچوں کی کہانی تھی، ظاہر ہے کہ میں بچی ہی تھی۔ اس کے بعد سے میں چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ کر اور کہانیاں لکھ کر بھیجتی تھی اور وہ چھپتی تھیں تو بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اس کے بعد اگلا TRANSITION یہ تھا کہ میں بچوں کے پروگراموں میں حصہ لیتی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن میں اور اس سے اگلا قدم یہ ہوا کہ عورتوں کے پروگرام ہوتے تھے۔ تو مجھ سے یہ کہا بیگم سعیدہ رضا نے کہ تم اس کے لیے اسکٹ لکھو۔ تو میں نے اس کے لیے اسکٹ لکھا تھا ''ریل کا سفر، مزاحیہ...... اس وقت میں فرسٹ ایر میں تھی...... صاحب، میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ مجھے اپنے بارے میں باتیں کرنا بڑا آکوارڈ لگتا ہے کہ میں، صاحب تفصیل بتاؤں کہ میں نے یہ کیا، وہ کیا...... بہرحال، جو اسکٹ میں نے لکھا تو اس میں ہم لوگوں نے ہی ایکٹ کیا۔ لڑکیاں، ہمارے کالج کی تھیں۔ اس کے بعد کچھ مضمون اس پروگرام کے لیے لکھے۔ پھر ''تہذیب نسواں'' میں لکھنے لگی۔ اسی طرح تو یہ بالکل گریجوئیل تھا۔ پھول، پھول سے بنات، پھر تہذیب نسواں...... اور اس کے بعد ایسا ہوا تھا کہ ہماری ایک نہٹوری عزیزہ تھیں، انھوں نے ایک دن کالج میں آکر بتایا کہ ''میں ایک ناول لکھ رہی ہوں جو کہ منشی فیاض علی کی انور اور شمیم سے بھی زیادہ بڑا ہوگا۔'' اور اس کا نام انھوں نے نیّر رکھا اور وہ اس کے CHAPTERS سنایا کرتی تھیں...... تو میں نے کہا کہ حمیدہ لکھ رہی ہیں تو پھر ہم بھی لکھیں گے۔ ورنہ بچوں کی کہانیاں لکھ رہی تھی، پریوں وریوں کی کہانیاں ACTUALLY اس سے مجھے تحریک ملی...... تو پھر صاحب، میں نے ایک افسانہ لکھا، یوں ہی بوگس قسم کا افسانہ...... اس کے بعد میں نے......

شہریار:

بوگس کی وضاحت کر دیجیے، ذرا ہم CONTENT معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی یہ ویسے ہی تھا۔ وار چل رہی تھی۔ اس زمانے میں، سکنڈ ورلڈ وار۔ ہماری سوسائٹی سے کسی کا میاں، کسی کا بھائی، کسی کا فیانسے وار پر جا رہا ہے۔ میرے اپنے دو ماموں، ایرفورس میں تھے، ایک آرمی میں۔ تو خیر اس افسانے میں بھی کچھ اسی زمانے کا ماحول دکھایا گیا تھا۔ اس افسانے کا ہیرو بھی جنگ پر جاتا ہے وغیرہ خیر......اس وقت کا ماحول کیا تھا؟ ماحول یہ تھا کہ ہم تو اتنے چھوٹے تھے کہ ہمیں کوئی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ یہ سارے رائٹرز ہمارے والدین سے ملنے آتے تھے۔ یہ سارے لوگ والدین کے گروپ کے لوگ تھے، تو میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کون آرہا ہے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ مجاز آئے ہوئے ہیں، یا جگر صاحب ہیں۔ جگر صاحب کھیلتے تھے ہمارے ساتھ، ہمیں طغرے لکھ کر دیتے تھے۔ وہ ہم لوگوں کو اپنی تحریر میں ہمارے نام لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے۔ علی عباس حسینی بیٹھے ہوئے ہیں، جوش صاحب بگھی سے اتر رہے ہیں۔ تو ہمیں یہ خیال ہوتا تھا کہ اور لوگ جیسے والدین سے ملنے آتے تھے ویسے ہی یہ لوگ ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں اور بنّے بھائی آتے تھے، تو کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک گروپ بنایا جا رہا ہے جو ترقی پسند کہلاتا ہے یہ EARLY FORTIES کی بات ہے۔ اس گروپ میں سبط حسن بھی تھے۔ دہرہ دون میں انگارے والے احمد علی میرے نانا اور والدہ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ غالباً یہ میری پیدائش سے قبل کی بات ہے۔ ''انگارے'' بعد میں چھپی تو مطلب یہ ہے کہ پرانے اور نئے سبھی طرح کے ادیبوں سے بچپن سے ہی واقفیت تھی۔ یہ سب باتیں میں ''کار جہاں دراز ہے'' میں لکھ چکی ہوں، دہرانا بوریت ہے......والد کے انتقال کے بعد دتی گئی۔ وہاں پر میں نے ایک اسکٹ لکھا، طنزیہ۔ 'ایک شام' کے نام سے۔ میں نے چچا مشتاق احمد زاہدی سے پوچھا کہ اسے چھپوا دوں، تو انھوں نے کہا کہ اپنے نام سے نہ چھپواؤ، اس لیے کہ کوئی مانے گا نہیں کہ رائٹر اتنی کم عمر ہے۔ تو میں نے لالہ رخ کے نام سے چھپوایا۔ وہ ادیب میں چھپا۔ ہاجرہ اور خدیجہ نے ابھی اسی وقت لکھنا شروع کیا تھا اور عصمت چغتائی پہلے سے لکھ رہی تھیں۔ اس کے بعد میں نے ایک آدھ افسانہ اور لکھا۔ اس طرح Adults کے رسالوں میں، میں نے لکھنا شروع کیا۔ اس وقت میں بی۔ اے فرسٹ

ایر اور سکنڈ ایر میں تھی...... اب جو بات شعور کی رو، کی کہی جاتی ہے تو وہ شعور کی رو بالکل بے ساختگی سے آئی تھی۔ جیسے ہم باتیں کر رہے ہیں، اسی انداز میں لکھ رہے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کو میں نے ایک افسانہ بھیجا۔ ویسے ہمارا کوئی افسانہ کبھی واپس نہیں آیا۔ انھوں نے لکھا کہ لکھتی رہئے۔ پہلے افسانے کے ساتھ انھوں نے اپنے ایڈیٹوریل میں اس کا خاص طور سے تذکرہ کیا۔

ابوالکلام قاسمی:

دہلی کے ایک سمینار میں کئی سال پہلے آپ نے اپنے پرانے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے جو پہلا افسانہ لکھا تھا اس وقت میں انٹرمیڈیٹ میں تھی اور اب سوچتی ہوں کہ وُہ بالکل تجریدی انداز کا افسانہ تھا...... اس سلسلے میں آپ مزید کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں بھئی! جب آج کل تجریدیت وغیرہ کی بات ہو رہی ہے...... آپ نے ''ستاروں سے آگے'' کے افسانے پڑھے ہی ہوں گے۔ تو مجھے لگتا ہے کہ وہ افسانے اس وقت بھی موڈرن انداز کے تھے۔ یعنی جس طرح کے افسانے اب لکھے جا رہے ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں، میں نے غالباً کئی افسانے اس طرح کے لکھے تھے۔ ان میں سے بعض افسانے ''ستاروں سے آگے'' میں شامل نہیں ہیں۔ وہ افسانے اگر ڈھونڈے جائیں تو دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر نا مجھے ان رسالوں کے نام یاد ہیں جن میں وہ چھپے تھے، بہت سے افسانے گم بھی ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ تر وہ شعور کی رو، کے ٹائپ کے افسانے تھے۔ مجھے یہ بات یاد ہے کہ اس زمانے میں لوگوں نے برابر کہا کہ آپ جو باتیں لکھتی ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ باقی ادیبوں کے افسانے سمجھ میں آ جاتے ہیں...... اور یہ کہ آپ انگریزی کے الفاظ کیوں استعمال کرتی ہیں اور یہ کہ آپ جو ماحول دکھاتی ہیں وہ بھی عجیب و غریب اور انوکھا ہوتا ہے۔ اس میں باتیں ہوتی ہیں کلب کی پارٹیوں کی۔ یہ تینوں اعتراض مجھے عجیب لگتے تھے۔ حالانکہ کوئی لمبی چوڑی بات ایسی نہیں تھی۔ نہ کوئی نظریات کی اور نہ دوسری طرح کی۔ بس یہ کہ لکھنا شروع کر دیا۔

ابوالکلام قاسمی:

لاہور سے جو رسالہ نصرت نکلا کرتا تھا اس میں کئی سال پہلے آئینے کے سامنے کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس میں مختلف تخلیق کاروں کی تحریریں ان کے اپنے بارے میں شائع کی جاتی تھیں۔ مجھے اگر غلط یاد نہیں تو آئینے کے سامنے، کے عنوان کے تحت آپ نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ "اگر میری تحریروں کو دیکھ کر کوئی مجھے رومانیت پسند کہتا ہے تو کہے، اس لیے کہ میں سمجھتی ہوں کہ کلاسیکی ذہن میرا نہیں ہے" میں یہ بات اس لیے بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ رومانیت کی اصطلاح ازم کے طور پر بھی استعمال ہونے لگی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔ میں بنیادی طور پر رومانٹک ہوں۔ دیکھیے، رومانیت جو ہے، ظاہر ہے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ تر جو دنیا کا ادب ہے اس کی بنیاد رومانٹک ہی ہے۔ رومانٹک اپروچ..... تو بہرحال میں بنیادی طور پر رومانٹک ہوں۔

شہریار:

کیا آپ اب بھی اس بات کی قائل ہیں کہ آپ کے افسانے اور ناول رومانٹک ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

یہاں ROMANTICISM سے میرا مطلب وہ رومانس نہیں ہے۔ عشق و محبت کا چکر نہیں ہے۔ ROMANTIC APPROACH IS SOMETHING TOTALLY DIFFERENT تو یہ ہے کہ آپ احساس، کھوج اور کرید، حسیت، وفور جذبات، IMAGINATION اور تحیر، انفرادیت پسندی اور بغاوت اور جو کچھ ہے، مطلب یہ ہے کہ جتنی اس طرح کی چیزیں ہیں ان ہی سے ROMANTICISM SPIRIT بنتی ہے اور اس میں تاریخیت بھی شامل ہے۔ وہ جو ادب کا رومانٹک اپروچ ہے وہ بالکل ضبط و توازن، تنظیم CLARITY OF THOUGHT ان باتوں سے مختلف چیز ہوتی ہے، جس نے کہ پورے ادب کا رخ بدلا، انیسویں صدی سے۔ وہ میرے خیال میں یعنی اس میں IMAGINATION اور

اندرونی THINKING PROCESS جو ہے اس پر زور دیا جاتا ہے۔

شہریار:

مثال کے طور پر آپ کے "آگ کا دریا" سے پہلے کے جو ناول اور افسانے ہیں ان میں TRAGIC ELEMENT کی نسبتاً کمی ہے۔ ان کو پڑھ کر جو مجموعی تاثر ہوتا ہے وہ کوئی اداسی، افسردگی یا SHOCK کا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے بعد "آخر شب کے ہم سفر"، یا ادھر کے جو ناولٹ ہیں آپ کے، ان کو پڑھ کر ایک اداسی کا تاثر ہوتا ہے یا اس میں POSITIVE DEPRESSION کا انداز یا DISILLUSIONMENT کا جو انداز شروع ہوا ہے؟......

قرۃ العین حیدر:

نہیں وہ تو آپ اگر اس طرح کہیں کہ بالکل اس میں ایک رومانی کرب ہونا چاہیے۔

ابوالکلام قاسمی:

ایسا ہے کہ یہ بات رومانیت کے حوالے سے نہیں کہی جا رہی ہے۔ یہ بالکل الگ بات ہے۔ اس کا تعلق پورے ناول کے موضوع سے ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا بھئی اصل میں، میں نے اس میں جو موضوع لیا تھا وہ، بہت مایوسی کا ہے۔ "آخر شب کے ہم سفر"، کا جو تھیم ہے وہ ایسا ہے کیا ہم سب کردار کے کرائسس کا مشاہدہ نہیں کر رہے ہیں اور DISILLUSIONED نہیں ہیں؟

شہریار:

یہ میں اعتراض کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جو اعتراض لوگ کرتے ہیں یا پہلے کی تحریروں پر جو لوگ اعتراض کیا کرتے تھے کہ نشاط کا عنصر زیادہ ہے۔ یا کوئی ایسی زندگی پیش کی جا رہی ہے جس میں کوئی تناؤ یا TENSION نہیں ہے۔ یا جو گہرائی ہونی چاہیے وہ نہیں ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو آپ کے پہلے کے ناولوں اور افسانوں کے بارے میں کچھ لوگ کہا کرتے تھے...... کہ کیریکٹر مسائل کی زیادہ فلسفیانہ گہرائیوں میں جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے

برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ "آگ کا دریا" سے آپ کے یہاں فلسفیانہ گہرائی پر جو زور ہے۔یعنی صورت حال کو زیادہ گہرائی میں دیکھنے کا۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے، ایک بات میری سمجھ میں یہ نہیں آتی کہ رائٹر کی عمر اور تجربے میں بتدریج اضافے کے پروسس کو کیوں نظرانداز کیا جاتا ہے جو چیز میں نے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں لکھی ہے اس میں وہ گہرائی نہیں ہو سکتی جو میں آج لکھ رہی ہوں۔آپ نے بھی جو شاعری کی ہوگی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ظاہر ہے مختلف رہی ہوگی، آپ کی آج کی شاعری سے۔

شہریار:

مگر ہم اس کے برعکس صورت بھی دیکھتے ہیں۔ہمارے یہاں بہت سے افسانہ نگار ایسے ہیں جن کی REVERSE ORDER میں ترقی ہو رہی ہے۔مثال کے طور پر عصمت چغتائی کی پچھلی کہانیوں میں جو DEPTH نظر آتی ہے نسبتاً وہ موجودہ کہانیوں میں نہیں ملتی۔

قرۃ العین حیدر:

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جیسے 'میرے بھی صنم خانے'، جس وقت میں لکھا ہے اس وقت بالکل ٹین ایج میں تھی I MEAN UNDER TWENTY اور اس وقت میں نے کوشش کی تھی دیکھنے کی کسی حد تک گہرائی سے۔

شہریار:

UNDER CURRENT کے طور پر جو رہا۔لیکن جتنا نمایاں اب ہے اتنا اس وقت نہیں تھا۔

قرۃ العین حیدر:

NATURALLY عمر کے ساتھ جو انسانی تجربہ بڑھتا ہے یا جو MATURITY آتی ہے وہ تو لامحالہ ہوگا۔

ابوالکلام قاسمی:

اس سلسلے میں، میں ایک سوال یہ کرنا چاہوں گا کہ آپ کے یہاں جو اداسی کا عنصر ہے، یا زندگی کے بارے میں زیادہ REALISTIC APPROACH ہے اور پھر ایسا لگتا ہے کہ گویا ہر چیز سے انسان کی گرفت کمزور پڑتی جارہی ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انسان کا پورا قابو ہو اور اخیر میں اس کا انجام اداسی یا بے بسی پر ہوتا ہے اس لیے کہ بالآخر سامنے یہی آتا ہے کہ انسان اس پر پورا قابو نہیں پاسکتا۔ تو معلوم کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس انجام تک کرداروں کو پہنچانے کے لیے کیا آپ کہانی کا پورا SYSTEM پہلے سے اپنے ذہن میں تیار کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

مطلب۔ کیا اداسی SYSTEMATIC ہے یا کچھ اور؟

ابوالکلام قاسمی:

نہیں۔ اداسی نہیں۔ بلکہ زندگی کے بارے میں آپ کے نقطۂ نظر کی تشکیل جس طرح پر ناول اور افسانے میں نظر آتی ہے وہ کیا منصوبہ بند طریقے پر آپ پیش کرتی ہیں؟

شہریار:

پورا اس کا تنوع، وسعت اور اس کے جتنے DIMENSIONS ہو سکتے ہیں۔ کیا ان سب پر آپ کی نظر پہلے سے ہوتی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے، ایک بات میں آپ لوگوں کو بتادوں کہ میں اپنا ادب اپنے اوپر لادتی نہیں ہوں کہ ہر وقت بیٹھ کر ادب کی بات کروں۔ میں اپنے ادب کی، اپنے لکھنے کی بات ہی نہیں کرتی ہوں۔ اگر ہر وقت بیٹھ کر یہ کہوں کہ صاحب میرے فلاں فلاں ناول میں یہ ہے اور میں نے فلاں کردار سازی یوں کی۔ میں نے فلاں ناول لکھتے وقت یہ لکھا۔ اگر میں اس طرح کی باتیں کروں جو میں کبھی نہیں کرتی تو شاید آپ لوگ سوچتے کہ صاحب، جیسے لکھتی ہیں ویسی باتیں بھی کرتی ہیں۔ لیکن میں وہ نہیں کرتی۔

اوک لینڈ یونیورسٹی کے کارلو کاپولا کئی سال سے متواتر مجھے خط لکھ رہے ہیں کہ ”ہم نے

احمد علی کے متعلق ایک ضخیم اسپیشل نمبر اپنے انگریزی رسالے میں شایع کیا ہے۔ ہم آپ کے متعلق بھی اسی طرح کا نمبر شایع کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ افسانے آپ کے ہم نے جمع کر لیے ہیں۔ کچھ آپ بھی بھیج دیجیے اور نقادوں کے مضامین وغیرہ' میں نے آج تک اس طرف دھیان نہیں دیا۔ ابھی مجھے کسی نے بتایا کہ مشی گن یونیورسٹی سے انتظار حسین کے متعلق اسپیشل نمبر یا کتاب چھپ گئی ہے۔ ایک امریکن خاتون ڈاکٹر فلیمنگ نے' آگ کا دریا' کے متعلق بے حد مفصل مضمون چند سال قبل لکھا۔ وہ وہیں شایع ہوا تھا، میں نے اس کا بھی یہاں کوئی تذکرہ نہیں کیا، نہ اس کا ترجمہ اردو میں چھپوایا۔ یہاں چند اردو رسائل کے مدیر اصرار کرتے رہتے ہیں کہ ہم آپ کا ضخیم فن و شخصیت نمبر شایع کرنا چاہتے ہیں یا اسپیشل نمبر وغیرہ۔ میں ٹال مٹول کرتی رہتی ہوں۔ اپنی کہانیوں کا انگریزی ترجمہ میں نے خود کیا ہے جو السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں شایع ہوئی ہیں۔ ان کا مجموعہ انگریزی میں کتابی صورت میں میں نے آج تک نہیں چھپوایا۔' آگ کا دریا' کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اس کا پورا مسودہ اسی لاپروائی میں کہیں گم ہو گیا۔ '' آخر شب کے ہم سفر''، کا ترجمہ حیدر آباد کے تقی بلگرامی صاحب نے خود اپنے شوق سے کیا۔ میں نے بھی تین چوتھائی کر ڈالی۔ وہ مسودے بھی اسی طرح کہیں پڑے ہوئے ہیں۔ رپورتاژ اور متفرق مضامین آج تک کتابی صورت میں نہیں چھپوائے۔ وہ پاکستان سے بعنوان پکچر گیلری، کسی نے شایع کر لیے۔ حال ہی میں اس طرح آگ کا دریا، کا یہاں دتی میں پھر غیر قانونی ایڈیشن شایع ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ابوالکلام قاسمی:

یہ تو ہم سب کو اندازہ ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی بے نیازی نے آپ کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ مگر جو لوگ بہت چاق و چوبند رہتے ہیں ان کا حشر بھی ہمیں معلوم ہے۔

شہریار:

اچھا اس سلسلے میں آپ کی رائے چاہوں گا کہ جو نقاد یا ادیب ہمارے تخلیقی ادیب اپنے فن کے پروسس کے بتانے پر قادر ہوتے ہیں، عام طور سے ان کی تخلیقات بس یوں ہی ہوتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔

شہریار:

اسی لیے تنوع ہے آپ کے یہاں اور کسی چیز کی تکرار نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جو اپنے فن کی وضاحت کرتے رہتے ہیں کہ ان کے فن کے کون سے اہم اجزا ہیں تو شاید شعوری طور پر ان اجزا کو لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

میں اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتی۔ کاہے کو بتاؤں بھئی۔ جو کچھ میں لکھ رہی ہوں لکھ رہی ہوں، پڑھ لو۔ اب میں اس کے لیے بیٹھ کے کیا بتاتی رہوں، جو نقاد ہیں وہ بتائیں......

ابوالکلام قاسمی:

میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک بات کی طرف آپ کی توجہ دلائی تھی مگر موضوع بدل گیا۔ وہ یہ کہ آپ کی ذاتی زندگی میں نظم وضبط کی خاصی کمی ملتی ہے۔ یعنی یہ کہ آپ روزمرہ کی زندگی میں خاصی لاپروا بلکہ اسے یوں کہیے کہ ALERTNESS کی بڑی کمی دکھائی دیتی ہے...... مگر آپ کے فکشن میں اس مزاج کا کوئی عکس نہیں ملتا۔ آپ تخلیق کار کی حیثیت سے خاصی ALERT اور منظم قسم کی تخلیق کار نظر آتی ہیں۔ کہانی کی ساری جزئیات پر آپ کی نظر ہوتی ہے۔ ابتدا میں اگر کوئی تاثر ابھارا گیا تو آخر تک اس کو باقی رکھنے یا پھر اسے DEFEND کرنے کی کوشش کرتی ہوں یا پھر ناول کے کرداروں کے عمل کا جواز خود ناول میں مل جاتا ہے۔ تو کیا اس پورے نظام کی تشکیل یا ناول کا منصوبہ اپنے ذہن میں بنانے کے سلسلے میں آپ پہلے سے غور وخوض کرتی ہیں یا پھر لکھنے کے دوران یہ نظم وضبط خود بخود بنتا چلا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں بھئی...... میں بنیادی طور پر بہت سنجیدہ خاتون ہوں (قہقہہ) ایسی بات نہیں ہے۔ ایسا تھوڑا ہی ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں ہر وقت ہو ہو، ہا، ہا۔

شہر یار:

لکھنے کے دوران آپ EXCITEMENT تو محسوس کرتی ہوں گی۔ یعنی جو آپ لکھ رہی ہیں اس میں آپ کوئی خاص بات کہنے جارہی ہیں یا جو کردار آپ تخلیق کر رہی ہیں وہ کچھ مسرت بخش احساس سے دوچار کرتے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

CREATIVE PROCESS کے بارے میں بتانا بہت مشکل ہے۔

شہر یار:

CREATIVE PROCESS کی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایسی چیز ہے کہ مسرت ہو رہی ہے یا DEPRESSION ہو رہا ہے یا کوئی آ گیا تو اس عالم میں کوفت ہو رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

شاید اس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے۔ ''آخر شب کے ہم سفر''، کے بارے میں، میں نے ذکر کیا ہے۔ دو چیزوں نے مجھے یہ ناول لکھنے کے سلسلے میں INSPIRE کیا تھا فیض صاحب کے ساتھ مجھے ایک صاحب ملے، لاہور کے کسی ریستوراں میں میں اور فیض صاحب اور ایک ہماری کزن تھی۔ ہم لوگ پہنچے ہی تھے کہ اس وقت ایک اور صاحب آ کے بیٹھے، تو وہ شارک اسکن کی شیروانی پہنے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ان کے 555 کا ٹن تھا وہ آ کے بیٹھ گئے، باتیں کرنے لگے۔ فیض صاحب نے ملوایا کہ ''یہ فلاں صاحب ہیں۔ یہ میرے ساتھ CONSPIRACY کیس میں جیل میں تھے۔''

............ایک تو میرے دماغ میں وہ بات رہی۔ وہ میں نے آخر میں دکھلایا ہے 555 کا ٹن لیے ہوئے ریحان الدین احمد کو اور ایک واقعہ اور تھا۔ بس ان دو چیزوں سے اس ناول کی تحریک ملی۔ وہ یہ تھا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مجھے بلایا گیا تھا۔ وہاں کے اردو ڈپارٹمنٹ میں۔ وہاں فنکشن کے موقع پر چائے ہو رہی تھی، ایک صاحب دور بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے مجھ سے یہ کہا کہ یہ فلاں فلاں ہیں۔ یہ انگریزوں کے زمانے کے مشہور کرانتی کاری تھے۔ مسلمان بنگالی تھے

وہ۔ یہ ہتھکڑی سمیت دریا کو پار کر کے بھاگ گئے تھے۔ یہ دو چیزیں میرے دماغ میں تھیں۔ ایک تو مجھے وہ کیریکٹر اور دوسرا 555 والے صاحب کا کردار...... ان دو چیزوں نے مجھ سے یہ ناول لکھوایا...... ظاہر ہے کہ جو اس وقت پوری سچویشن تھی۔ پورا SET UP تھا۔ جن حالات میں اور جن لوگوں کو ہم نے دیکھا کہ وہ کیا سے کیا ہو گئے وغیرہ۔ اب اس میں تو ظاہر ہے کہ THESE ......THINGS MAKE YOU SAD

شہریار:

اچھا صاحب، ایک بات جو آپ کے افسانوی ادب یعنی آپ کے ناولوں اور افسانوں کے برخلاف دوسرے فکشن لکھنے والے کے یہاں بہت واضح فرق معلوم ہوتا ہے۔ تاثر کے اعتبار سے یا تکنیک کے اعتبار سے آپ کے یہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کچھ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ کوئی چیز آپ بڑے پیمانے پر نہیں کہتیں تو چھوٹے پیمانے پر افسانے میں کہتی ہیں۔ اس طرح آپ کو ایک بہت اہم فکشن رائٹر ہم کہیں گے۔

اس لیے کہ آپ افسانہ لکھیں یا ناول لکھیں...... ان میں COMPARE کرنے کا بھی احساس نہیں ہوتا تو ایسا کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

اس لیے کہ ہم اچھا لکھتے ہیں...... (قہقہہ) آپ کا اس بات سے کیا مطلب ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مختلف SCALES پر جو لکھنے کا معاملہ ہے وہ یا کچھ اور......

شہریار:

اصل میں مختصر افسانے اور ناول وغیرہ میں اکیڈمک سطح پر فرق تو کیا جاتا ہے جیسے مختصر افسانہ ایک خاص تاثر دے گا ایک خاص مدت تک محدود رہے گا یا ایک خاص گوشے پر مرتکز رہے گا یا اس میں وحدت تاثر ہونی چاہیے۔ اس میں جہاں تک ہو سکے انفرادیت ہونی چاہیے۔ تو اس سلسلے میں موضوع تو مختلف ہوتا رہتا ہے مگر آپ کے اسٹائل میں CHANGE نہیں ہوتا۔

قرۃ العین حیدر:

اسٹائل میں CHANGE نہیں ہوتا ہے!...... بالکل؟

شہریار:

افسانے میں خصوصاً آپ کی THINKING جو ہے اس کی وجہ سے ایک بڑی حد تک اسٹائل برقرار رہتا ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

اس بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے ناولوں اور افسانوں میں صنفی قسم کے امتیازات سے زیادہ بحیثیت مجموعی فکشن کے فن پر، وسیع معنوں میں، توجہ ملتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں کہہ نہیں سکتی، صاحب، اصل میں ایسا ہے نا کہ وہ جو COOK ہوتا ہے نا وہ اپنی پکائی ہوئی ہنڈیا کے بارے میں صحیح نہیں بتا سکتا۔

شہریار:

چلیے، مختصر افسانے کے بارے میں اگر یہ کہیں تو ہم یقین کرتے ہیں مگر ناول، جیسے آپ نے ''آگ کا دریا'' لکھا ہے یا ''آخری شب کے ہم سفر'' ہے، ان کو تو شعوری طور پر DESIGN کیے بغیر یا تقسیم کا تعین کیے بغیر اس پیمانے پر لکھنا مشکل ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، آگ کا دریا، میں تو میں نے تقسیم طے کرلیا تھا۔ پورا میں نے اس کو CHAPTER BY CHAPTER تو پلان نہیں کیا تھا۔ میں ایسا کبھی نہیں کرتی 'آخر شب کے ہم سفر' کا تقسیم بھی اس طرح میں نے پلان کرلیا تھا۔

ابوالکلام قاسمی:

میں نے اس سلسلے میں جو پہلے عرض کیا تھا کہ کرداروں کی شخصیت کا تعین ان کے باہمی عمل اور تعامل کی صورت یا پھر مختلف صورت حال میں ابھرنے والے مسائل، کیا آپ کے ناولوں

میں کسی طے شدہ پلان کا حصہ نہیں ہوتے۔

شہریار:

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ناول میں یا افسانے میں جو کردار پیش کیے جاتے ہیں وہ ACTUAL نہیں ہوتے۔

قرۃ العین حیدر:

بعض بالکل UNREAL ہوتے ہیں اور بعض COMPOSITE ہوتے ہیں۔

شہریار:

تو اس طرح کے کرداروں کی تخلیق کرنے میں آپ نے ایسے کن کرداروں کو تخلیق کر کے خوشی محسوس کی، گویا وہ آپ کے کردار ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

کبھی میں نے کبھی سوچا ہی نہیں اس طرح بیٹھ کے میں ایسا کرتی بھی نہیں کہ اپنے ناولوں کے بارے میں بیٹھتی سوچتی رہوں کہ میں نے فلاں چیز یوں لکھی، فلاں کیرکٹر میں نے یوں لکھا۔

ابوالکلام قاسمی:

اچھا، اگر ہم اس وقت اس طرح دریافت کریں کہ کردار نگاری کا جو عام معیار اور انداز رہا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کا اپنا تخلیق کردہ ایسا کون سا کردار ہے جو آپ کو خود پسند آتا ہو یا ایک یا چند ایسے کردار آپ کے ایسے ہیں جن کو کردار نگاری کے فنی نقطہ نظر سے آپ ترجیح دیتی ہوں یا ایسے کردار کی تخلیق آپ کو اپنا ایک قابل ذکر کارنامہ نظر آتا ہو۔

قرۃ العین حیدر:

اب اگر آپ پوچھتے ہیں تو میں کیا بتاؤں؟ میں نے اتنے کرداروں کے بارے میں لکھا ہے۔ ہزاروں کردار ہیں۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔

ابوالکلام قاسمی:

ان کرداروں میں آپ فرق تو کر سکتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ امتیازات تو ہوں گے آخر؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں، مجھے ایک تو چمپلن کا کردار پسند آیا ہے، اگلے جنم مو ہے بٹیانہ کیجو، میں اور ایک صدف کا......اچھا صاحب، اس کا بھی واقعہ بتاؤں آپ کو، ایک کیریکٹر جو ہے، قمرن، یہ تقریباً اصلی ہے۔ یعنی اس حد تک اصلی ہے کہ اس قسم کی ایک خاتون تھی۔ جس کو بہت زیادہ EXPLOIT کیا گیا۔

ابوالکلام قاسمی:

مثال کے طور پر میں آپ سے پوچھوں کہ ''آگ کا دریا'' میں چمپا کے کردار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کا INSPIRATION آپ کو کہاں سے ملا اس لیے کہ یہ بہت عجیب اور جامع قسم کا کردار ہے......

قرۃ العین حیدر:

چمپا...... چمپا کا معاملہ یہ ہے کہ IT IS MORE OR LESS SYMBOLIC یعنی میں نے INDIAN WOMEN HOOD کے مختلف PERIOD لیے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی لمبی چوڑی بات نہیں ہے۔ بس یہ کہ ایک زمانے میں عورت یوں تھی پھر یوں تھی اور ایک زمانے میں یوں ہوئی۔ یا یہ کہ فیوڈل دور میں عورت فقط طوائف ہی بن کے اپنی اہمیت منوا سکتی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

شہریار:

آپ کے افسانوں میں ایک چیز کا احساس ہوتا ہے کہ ''آگ کا دریا'' کے پہلے کے آپ کے افسانے ناول اور خود آگ کا دریا بھی۔ ان میں کہانی پن کا وہ عنصر نہیں ہے جو ہر عام آدمی کو اپیل کر سکے۔ لیکن ادھر آپ نے جو ناولٹ لکھے ہیں اور یہ 'آخر شب کے ہم سفر' یہ عام آدمی بھی اسی طرح ڈوب کے پڑھتا ہے۔ ان میں کہانی پن کا عنصر نسبتاً زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کے تجسس کو اس کی CURIOSITY کو یہ عنصر اپیل کرتا ہے۔ اس میں MYSTRY کا ELEMENT بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے تحیر کا بھی معاملہ ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

آگ کا دریا، کا تو موضوع ایسا تھا کہ اس میں کہانی اس طریقے سے آ ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے کہ بہت سی کہانیاں تھیں۔

شہریار:

کیا ایسا نہیں کہہ سکتے کہ 'آگ کا دریا' سے پہلے جو چیزیں یعنی افسانے اور ناول لکھتی رہیں یا اس طرح جو تیاری کرتی رہیں، اس کا بھرپور اظہار 'آگ کا دریا' میں ہوتا ہے یا وہ تکنیک وہاں پر ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد.....

قرۃ العین حیدر:

اجی، کوئی تکنیک وکنیک نہیں۔ بس لکھ دیا.....

شہریار:

وہاں تک تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک تجربے پر' انوکھے پن پر زیادہ زور ہے۔ اس کے بعد آپ نے افسانے یا ELEMENT STORY کو جسے آپ بنیادی طور پر کہانی کا تصور کہہ سکتی ہیں، اس کی طرف آپ نے توجہ دی.....

قرۃ العین حیدر:

وہی، میں آپ سے کہہ رہی ہوں نا کہ کبھی کوئی CREATIVE WRITER تھیوریز اپنے سامنے رکھ کے نہیں لکھتا..... یہ آپ سمجھ لیجیے کہ اب مجھے کلاسیکل طریقے سے لکھنا چاہیے، اب میں ایسا افسانہ لکھوں کہ جس میں وحدت تاثر بھی ہو۔ فلانا ہو۔ CHARACTERISATION ہو یہ سب کم از کم میں نہیں کرتی۔

ابوالکلام قاسمی:

مگر تکنیک یا اسٹائل کا کوئی نہ کوئی تصور تو ضرور آپ کے ذہن میں رہتا ہوگا۔ یہ بات اس لیے بھی زور دے کے کہی جاسکتی ہے کہ آپ کی چیزیں نئی سے نئی تکنیک میں ہیں دوسرے الفاظ میں آپ کے ہاں تکنیک کا تجربہ اچھا خاصا ہے۔

شہریار:

چلیے اسے یہ فرض کر لیجیے کہ ایک نقاد ان سطحوں پر تقسیم کرتا ہے فکشن کو؟

ابوالکلام قاسمی:

انھیں کرنے دیجئے......

شہریار:

نہیں اگر اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک زمانے تک آپ نے ایسا لکھا کہ جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اس طرح کی زندگی جو ٹھوس اور اصلی زندگی ہے اس سے آپ کا واسطہ اس طرح کا نہیں پڑا۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی، ٹھوس زندگی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا ذہنی زندگی ٹھوس زندگی نہیں ہوتی، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی آج تک کہ یہ جو میرے بارے میں کہا جاتا ہے......ایک تو یہ کہ ''یہ اونچے طبقے کے بارے میں لکھتی ہیں، یہ تو بڑی بے وقوفی کی بات ہے۔

شہریار:

یہ تو بہت پرانی بات ہوگئی......اب کوئی نہیں کہتا......

قرۃ العین حیدر:

اچھا پرانی بات ہوگئی......چلیے I AM GLAD

ابوالکلام قاسمی:

اب تو فکشن کا کوئی سنجیدہ نقاد اس طرح کے طبقوں وغیرہ کی تقسیم کا ذکر بھی نہیں کرتا البتہ یہ ضرور ہے کہ عام طور پر اپنے ذہنی تحفظات کی عینک کے بغیر ابھی ہمارے ہاں، شاعری کی طرح فکشن کو دیکھنے کا چلن عام نہیں ہوا ہے......

شہریار:

ویسے اب ''آگ کا دریا'' کے بعد کے زمانے میں کوئی اس طرح کی بات نہیں کہتا کہ

کہانی کا عنصر نہیں پایا جاتا یا زندگی پائی جاتی یا کیریکٹر؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں، میں اعلیٰ طبقے والی بات کہہ رہی تھی......

شہریار:

نہیں ایسی بات نہیں ہے......آپ کے ناولٹ وغیرہ میں تو ہر طرح کے طبقے آتے ہیں......

قرۃ العین حیدر:

سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ لوگ جو کہتے ہیں ٹھوس زندگی والی بات ٹھوس زندگی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے شیشے کے گھر والے افسانے لکھے تھے، وہ آپ لوگوں نے پڑھے ہوں گے...... یہ افسانے ہیں EARLY FIFTIES کے تو وہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر انھیں پڑھا جائے تو اندازہ ہوگا۔ بھئی ٹھوس زندگی کیا چیز ہے؟ IT IS A VERY RELATIVE TERM

شہریار:

مثال کے طور پر ہم کہیں کہ آپ نیچر یا رنگوں کے سلسلے میں جو جزئیات بیان کرتی ہیں وہ ایسی زندگی سے لیا جاتا ہے جو وجود تو رکھتی ہے مگر وہ RELATIONSHIP جو آپ تلاش کرتی ہیں وہ حقیقی اور نیچرل نہیں معلوم ہوتی......

قرۃ العین حیدر:

بات بڑی دیسی ہے، کیا کہتے ہیں POMPOUS......لیکن ایک ایسا پہلو بھی ہوتا ہے زندگی کا THROUGHOUT چوبیس گھنٹے کی زندگی کا جس کا کہ MYSTICAL METAPHYSICAL رشتہ بھی ہے، حقیقت سے اور ماورائے حقیقت سے......اگر آپ اس رشتے کو بھی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں......اس تک آپ کا BEAM جو ہے وہ پہنچا ہوا ہے یا پہنچ گیا ہے......میرا دعویٰ نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں اس کو بھی پکڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔ لہٰذا وہ چیز اس طرح آئے گی۔

ابوالکلام قاسمی:

آپ کے یہاں، VALUES کا جو اندازہ ہوتا ہے یا آپ جو ہر واقعہ کے پیچھے کسی فلسفیانہ جہت کی خاموش نشان دہی کرتی معلوم ہوتی ہیں...... یہ باتیں حقیقت کی ظاہری سطح کے مقابلے میں ماورائے حقیقت کا احساس تو دلاتی ہیں۔

شہریار:

آپ زندگی کے مختلف DIMENSIONS اور پیچیدگی کو پیش کرنے کی طرف بہت زیادہ الرٹ معلوم ہوتی ہیں......

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے، پیچیدگی کو پیش کرنا جو ہے وہ تو ایک ماہر اقتصادیات بھی پیش کر دے یا نفسیاتی پیچیدگی ایک ماہر نفسیات بھی پیش کر دے گا۔ میں جو چیز بتانے کی کوشش کر رہی ہوں وہ شاید میں EXPRESS نہیں کر سکتی۔ اصل میں ایک تیسری آنکھ ہوتی ہے...... پھر میں POMPOUS ہو رہی ہوں۔

ابوالکلام قاسمی:

آپ شاید یہ کہنا چاہتی ہیں کہ انسان اپنی مادی زندگی کے ساتھ ساتھ ذہنی زندگی بھی جیتا رہتا ہے یا اس کے جو مابعد الطبیعاتی رشتے ہوتے ہیں......

قرۃ العین حیدر:

روحانیت وغیرہ کو چھوڑ دیجیے...... ہر سین، ہر منظر جو آپ دیکھ رہے ہیں اس کو جس طرح آپ دیکھیں گے۔ بہ حیثیت ایک فن کار کے وہ ایک عام آدمی نہیں دیکھ سکتا۔ ہر رائٹر اور ہر شاعر ''جو لکھ رہا ہے اس کے پاس وہ چیز ہوتی ہے...... میں جو بات کہنا چاہتی ہوں وہ روحانیت سے مختلف ہے۔ آپ شاید CONVINCE نہیں ہوئے؟

ابوالکلام قاسمی:

آپ کہتی ہیں تو ہوئے جاتے ہیں......

قرۃ العین حیدر:

میں نے جلاوطن 1952 میں لکھا تھا.....

شہریار:

جی ہاں، اس میں تو مذہب یا فلسفے کی چھوٹ بڑی نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں صاحب۔ یہ محض مذہب اور فلسفہ بھی نہیں ہے۔I CAN'T EXPLAIN TO YOU

شہریار:

وہ ELEMENT OF PATHOS ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں وہ بھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر میں نے آپ کے رسالے (افکار) کے لیے جو مضمون لکھا ہے..... ''عالم آشوب''..... ہم بس میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔ بس میں تین عورتیں باتیں کر رہی تھیں کہ ''فلاں جگہ ایک مندر ہے وہاں کسی نے جو کچھ کیا ہو دھرا ہو وہ سب اتر جاتا ہے'' جانے کہاں سے آ رہی تھیں؟ کیا امیدیں وہ لے کر آ رہی تھیں؟ کیا PROBLEMS تھے ان کے؟ بس رکی تو وہ اتریں۔ انھوں نے ایک تانگہ کیا.....اور وہ تانگہ پہاڑی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی مندر تھا بالا جی کا، جہاں بھوت پریت..... جانے کیا کرتے تھے.....اب یہ منظر جو تھا.....اس نے مجھے بہت DISTURB کیا۔ اس پوری چیز نے۔ سارے لوگ بیٹھے تھے، کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ اب یہ چیز جو ہے وہ AND I WROTE ABOUT IT TO GET A KIND OF LIBERATION ہر وقت انسان بہت سی چیزیں دیکھتا رہتا ہے۔ ہوتی رہتی ہیں۔ رائٹر جو ہے یا شاعر، وہ اس چیز کو پہچان لیتا ہے۔ THIS IS WHAT I AM TRYING TO SAY

شہریار:

اس کو فلسفیانہ کہیں تو زیادہ بہتر ہے.....

قرۃ العین حیدر:

نہیں HUMAN COMEDY یا HUMAN CONDITION کا مشاہدہ۔

ابوالکلام قاسمی:

اصطلاحی معنوں میں چاہے آپ اس سے ملتے جلتے ELEMENT کو روحانیت کا نام نہ دیں لیکن آپ کے اس ELEMENT کی چھینٹ جگہ جگہ پڑتی نظر آتی ہے۔ اسی کو ہم صوفیانہ زاویہ نظر کا نام دیتے ہیں۔ وہ جو بار بار آپ کی تحریر میں سامنے آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بے حد آتا ہے۔ بے حد ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفیانہ نقطہ نظر والی بات آپ مانتی ہیں۔ ویسے یہ شعوری بھی ہو سکتا ہے اور غیر شعوری طور پر بھی اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں تو تصوف میں بے حد دلچسپی رکھتی ہوں۔ بہت دلچسپی ہے۔

شہریار:

تصوف، جو اعلیٰ انسانی اقدار میں چھن کے پہنچتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اعلیٰ انسانی اقدار جو ہیں وہ بھی ہیں، مگر مجھے تو صاحب ہر چیز میں دلچسپی ہے۔ جتنی بھی HUMAN ACTIVITIES ہیں۔ انسان کیا کیا کرتا ہے مسرت کے حصول کے لیے۔ اس کی عجیب وغریب کوششیں ہوتی ہیں۔ مجھے تو تصورات تصوف کا پورا سلسلہ بہت زیادہ فیسی نیٹ کرتا ہے میں نے تو اس پر تھوڑا بہت کام بھی کیا ہے۔ اور بھی کرنے کا ارادہ ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

آپ کی تحریروں میں جا بجا مختلف صوفیوں کے نقطہ نظر کا عکس ملتا ہے، بلکہ بعض باتیں

تصوف کی گونج معلوم ہوتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، ہیں......

ابوالکلام قاسمی:

تو یہ انداز نظر آپ کے ہاں کیسے آیا؟ اس کے پیچھے آپ کا علم کارفرما رہا ہے یا آپ کا ذاتی زاویہ نظر......

قرۃ العین حیدر:

نہیں علم تو نہیں...... علم کا تو ایسا ہے کہ بہت سے لوگوں نے تصوف کو پڑھا ہے اور پڑھ کر چھوڑ دیا ہے۔ بنے بھائی (سجاد ظہیر) بھی تصوف پڑھتے تھے پڑھنے کے لیے مارکسسٹوں نے تصوف بہت پڑھا ہے۔ فیض صاحب نے بہت پڑھا...... ہماری تو اپنی دلچسپی ہے اس سے......

شہریار:

لیکن ہمارے یہاں تصوف کے بارے میں یہ رویہ رہا ہے کہ اس کا رول منفی رہا ہے یا یہ کہ یہ ہماری معاشی ترقی میں حائل رہا ہے......

قرۃ العین حیدر:

رویے تو بہت سے تھے۔ ان کا ایک رویہ تو یہ بھی تھا کہ ان کے یہاں انسان دوستی تھی...... یہ صوفی عوام کے لیڈر تھے...... مجھے تو ان سب باتوں کے باوجود تصوف میں دلچسپی ہے۔ اکیڈمک اسلام میں دلچسپی ہے۔ COMPARATIVE RELIGION میں دلچسپی ہے۔ بہت زیادہ۔

شہریار:

اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ کے ابتدائی ناول یا افسانے سے اگر کوئی آپ کے بارے میں رائے قائم کرنا چاہے تو اسے خیال ہوگا کہ آپ بہت الٹرا موڈرن خاتون ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

وہ تو غالباً ہوگا۔

شہریار:

لیکن اپنی زندگی میں اگر بیک ورڈ کا لفظ استعمال کیا جائے، مگر یہ زیادہ سخت لفظ ہوگا............

قرۃ العین حیدر:

بیک ورڈ......مولوی

شہریار:

لیکن ایسا کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

یہ میری UPBRINGING کا اثر ہے۔اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

عموماً دیکھا گیا ہے کہ آپ جلسوں کی صدارت کرنے سے کتراتی ہیں یا مہمان خصوصی ہونے جیسی چیزوں کو ناپسند کرتی ہیں......اس انداز سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی سنابری ہے۔کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

میرا مزاج اس قسم کا ہے کہ میں اپنے آپ کو پروجیکٹ نہیں کرنا چاہتی۔تصویریں کھنچتی ہوتی ہیں تو میں عام طور پر کوشش کرتی ہوں کہ وہاں سے ہٹ جاؤں۔یہ اپنا مزاج ہے اس کو کیا کرسکتی ہوں۔میں ایک نہایت MODEST خاتون ہوں (قہقہہ) مثال کے طور پر ادبی جلسوں میں دوسرے ادیبوں کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنے کے لیے اصرار کیا جاتا ہے اور میں انکار کرتی ہوں۔

ابوالکلام قاسمی:

اچھا ایک اور بات میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ تیس سال سے زیادہ عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔اس پورے زمانے میں ادبی رویّوں اور ادیبوں کے سوچنے کے انداز میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔آپ کی تخلیقات کے بارے میں پہلے جس انداز میں لکھا گیا اور اب جو کچھ لکھا جارہا ہے

ان کے درمیان آپ کیا فرق محسوس کرتی ہیں اور آپ کی تحریروں پر جس طرح کے RESPONSES پہلے اور بعد میں سامنے آئے، اس کے بارے میں آپ کس طرح سوچتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے میری رائے بہت بُری ہے۔ پہلے تو ترقی پسندوں کی تنقید ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت وہی تنقید تھی...... اس نے مجھ کو بالکل OUTRIGHT کہا کہ یہ بورژوا ہیں۔ یہ فلاں ہیں، یہ ڈرائنگ روم کے بارے میں لکھتی ہیں۔ وہ تو معلوم ہے آپ لوگوں کو سارا قصہ...... I AM FED UP اور انھوں نے میری کسی کتاب کو سوائے چند ایک کے، میرے خیال میں احمد ندیم قاسمی نے ریویو لکھا تھا پڑھ کے۔ تین چار لوگوں نے اس زمانے میں، میرے بھی صنم خانے، پر ریویو لکھے اور افسانوں کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا اور جو الفاظ یا اصطلاحات میں نے اردو میں متعارف کیے، انھیں کو اب میرے لیے دہرایا جارہا ہے...... الوژن اور نوسٹلجیا۔ اب میرے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھیں ماضی کا نوسٹلجیا ہے۔ ارے، کاہے کا ہے؟ ماضی کا...... پھر یہ کہ وہ ماضی کی مرثیہ خوانی کرتی ہیں۔ فیوڈلزم کی مرثیہ خوانی کرتی ہیں...... خیر وہ تو چلتی ہیں۔ وہی باتیں سب لوگ دہراتے رہے۔ میرے خیال میں سنجیدگی سے جن لوگوں نے پہلی مرتبہ لکھنا شروع کیا وہ ''آگ کا دریا'' کے بارے میں لکھا بس۔ اس کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں لکھی گئیں۔ اس کے بعد جتنی میں نے لکھی ہیں ان پر بھی سنجیدگی سے بہت کم لکھا گیا۔

ابوالکلام قاسمی:

میرا خیال یہ ہے کہ افسانوں اور ناولوں پر ادھر وحید اختر، شمیم حنفی، شمیم احمد اور محمود ہاشمی نے جو کچھ لکھا ہے اسے ہم سنجیدہ کوشش سے ہی تعبیر کریں گے۔

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک ہے، INDIVIDUALS کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں یہ بات کہہ رہی ہوں کہ جس طریقے سے ان افسانوں کو CLICHES کے ذریعہ TREAT کیا گیا ہے، وہ میرے خیال میں بہت افسوسناک ہے۔

شہریار:

اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ افسانوی ادب پر ہماری تنقید نے زیادہ توجہ نہیں دی، شاعری پر بھی عموماً سرسری قسم کے مضامین لکھے گئے۔ اس طرح پوری تنقیدی صورت حال ایسی رہی مگر مجموعی طور پر پڑھنے والے آپ کو بہت توجہ سے پڑھتے ہیں اور آپ کا شمار اس وقت............

قرۃ العین حیدر:

واہ، واہ، کیا کہنے......

ابوالکلام قاسمی:

مجھے حیرت یہ ہے کہ آپ کہتی ہیں کہ مجھ پر کسی نے نہیں لکھا۔ جبکہ اردو کے فکشن لکھنے والوں میں اگر کسی ایک پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے، پچھلے پندرہ بیس سال کے دوران تو وہ آپ پر لکھا گیا ہے۔ ویسے لکھی جانے والی تحریروں کی سطح کی بات الگ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

مگر کس طرح لکھا گیا ہے؟ کیوں نہیں، اس کا گہرا مطالعہ کیا گیا۔ مثال کے طور پر کارِ جہاں دراز ہے، میں، میں نے کوشش کی پہلی مرتبہ اردو میں NON FICTION ناول لکھنے کی۔ اس پر صاحب جو میں نے باتیں سنیں وہ عجیب وغریب باتیں تھیں، کہ صاحب اپنے خاندان کی بڑائی کر رہی ہیں۔ یلدرم کو انھوں نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے لیے یہ لکھا ہے کہ پیانو بجاتی تھیں۔ اس LEVEL کی تنقید ہے۔ اس کے اسٹائل پر، یا اس کا جو پلان ہے، اس کی جو زبان ہے۔ یعنی ان چیزوں کے بارے میں ہندستان میں لکھا ہی نہیں گیا۔ پاکستان میں اس کتاب کو سنجیدگی سے پڑھا بھی جا رہا ہے اور اس پر سمجھداری کے مضامین بھی لکھے گئے ہیں......

شہریار:

اس لیے نہیں لکھا گیا کہ ہمارے نقاد، جتنا وقت ادب کے لیے دینا چاہیے وہ نہیں دیتے اور ایک رائے جو عام ہو جاتی ہے وہی دہرائی جاتی رہتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

مجھے بہت تعجب ہے اس پر اس ناول نے ایک نیا TREND یہ شروع کیا کہ اب روز سننے میں آ رہا ہے کہ فلاں صاحب سوانحی ناول لکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے اردو میں پہلی دفعہ اس طرح کی چیز لکھنے کی کوشش کی۔

شہریار:

دیکھیے جدید افسانوی ادب میں جو بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں وہ آپ کی تحریروں کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔

ابوالکلام قاسمی:

میرا خیال بھی یہی ہے کہ اگر آپ کی تحریریں اس قدر متنوع انداز میں سامنے نہ آئی ہوتیں تو بندھے ٹکے افسانے کے مسائل عرصے تک دہرائے جاتے رہتے اور یہ کسی تخلیق کار کا بہت بڑا کارنامہ ہوتا ہے کہ وہ تنقید کو اس کے حدود سے اس کی فارمولے بازی سے باہر نکالے۔ اس لیے کہ تنقید ہمیشہ اپنے لیے آپ BARRIERS قائم کرتی ہے۔ کچھ اصول بناتی ہے اور ان کا انطباق کرتی ہے مگر اسی وقت یہ اصول ٹوٹ جاتے ہیں یا حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں، جب کوئی ایسی چیز سامنے آ جائے جو ناگزیر بھی ہو اور مروجہ تنقیدی پیمانوں کے چوکھٹے میں فٹ بھی بیٹھتی ہو تو آپ کی تحریروں کے سبب سے کم سے کم یہ تو ہوا ہی ہے کہ افسانوی ادب کی تنقید کی حد بندیاں ٹوٹی ہیں...... نقادوں کی سہل پسندی ختم ہوئی ہے۔

شہریار:

جیسے محمد حسن عسکری صاحب کے بارے میں انتظار حسین نے لکھا تھا کہ عسکری صاحب ایک بات شروع کرتے تھے اور جب لوگ ان کے موضوع میں شریک ہونے لگتے تھے تو وہ دوسری طرف مڑ جاتے تھے اور دوسرا موضوع شروع کر دیتے تھے۔ اس لیے اگر کل دقتی نقاد ہو جو آپ کی تحریروں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے، اس پر غور کرے تو بات بن سکتی ہے۔ عموماً جس طرح کے مضامین وغیرہ رسالوں کے لیے لکھتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ کسی TREND پر لکھ کر ایک ساتھ کئی

آدمیوں کو خوش کر سکتا ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا EXACTLY تو یہاں خوش کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ ہے۔ تنقید کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں مسئلہ اسلوب کا نہیں یا مسئلہ اس چیز کا نہیں ہے کہ ناول کیا ہے یا افسانہ کیا چیز ہے۔ وہ کس طرح لکھا جارہا ہے، یا کس طرح نہیں لکھا جارہا ہے۔ بس مسئلہ PERSONALITIES کا۔

شہریار:

اچھا صاحب، ایک سوال، جس کا تعلق براہ راست آپ کے فن سے نہیں ہے، لیکن اردو ناول کی صورت حال سے ہے۔ وہ یہ کہ کیا وجہ ہے کہ اردو ناول کا ارتقا بہت ہی عجیب انداز میں ہوا۔ یعنی ایک زمانہ آیا جب ناول لکھے گئے پھر بہت مدت بعد لکھے گئے...... پھر یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ فکشن اتنا خواص کے لیے کبھی نہیں ہوتا جتنا ہمارے یہاں ہو گیا ہے۔ POPULAR لکھنے والے الگ ہیں اور سنجیدہ رائٹرز الگ ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سے ہم نے کوئی فائدہ حاصل کیا یا اس سے ہمارے افسانوی ادب کو نقصان پہنچا؟

قرۃ العین حیدر:

اردو ادب شاعری کی حد تک تو ایک مقبول ادب ہے، مشاعروں کی وجہ سے اور افسانوی ادب تو شروع ہی سے ELITIST رہا ہے۔ جس وقت ترقی پسندوں نے یہ کہا کہ صاحب ہم عوام تک پہنچ گئے ہیں تو میں نے ان سے پوچھا کہ FACTS اور FIGURES دیجیے کتنا PERCENTAGE ہے آبادی کا جو اردو جانتا ہے، خصوصاً دیہاتی آبادی کا اور اس میں کتنے پرسینٹ نے آپ کے کتنے رائٹرز کو پڑھا۔ اس لیے کہ آپ کہتے ہیں کہ ہم نے عوامی ادب تخلیق کیا...... تو یہ عوامی ادب کسی وقت رہا ہی نہیں...... سوائے اس ادب کے جو کہ عوامی رسالوں میں چھپا ہے۔ پھر وہی بات آجائے گی۔ گلشن نندا۔ اب آپ دیکھیے کہ ہر جگہ وہی پڑھے جارہے ہیں یا ROMANTIC NOVELS پڑھے جارہے ہیں۔ مگر یہ بات تو UNIVERSAL ہے۔ نہایت INTELLECTUAL قسم کا جو ادب ہوتا ہے وہ اس طرح مقبول ہو ہی نہیں سکتا۔ مغرب میں بھی،

بلکہ پوری دنیا میں جس طرح کے جیمس ہاڈلی چیز یا براکار ٹلینڈ پڑھی جاتی ہے اس طرح سال بیلو نہیں پڑھا جاتا..... مگر ان معاشروں میں پاپولر ناولوں کے پڑھنے پر لوگ ناک بھوں نہیں چڑھاتے۔ جس طرح ہمارے یہاں ہوتا ہے جیسے کسی کے ہاتھ میں بیسویں صدی نظر آجائے تو اسے بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہم تو نہیں دیکھتے..... ہم تو خود شمع پڑھتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ سنجیدہ ناول کم لکھے جارہے ہیں، پاکستان میں تو بہت لکھے جارہے ہیں۔ یہاں اردو میں کم لکھے جارہے ہیں، جبکہ دوسری زبانوں میں بہت لکھے جارہے ہیں۔ اس کی بہت سے وجہیں ہیں۔ پبلشر نہیں ہیں۔ READING PUBLIC نہیں ہے یہاں پر۔ حالانکہ وہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ابھی وہاں سے سائرہ ہاشمی نے میرے پاس ایک کتاب بھیجی ہے، وہ صرف پانچ سو چھپی ہے۔

شہریار:

اچھا یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ ناول اور افسانے کی ترقی کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ ناول نگار اس کو ذریعہ معاش بنا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا یہاں معاشی حالات بہتر ہوجائیں تو اچھے ناول کی توقع کی جاسکتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ تو بڑا ویسا ہی سوال ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کیا ہوتا؟ بہت سے لوگ ہیں جو خوش حال ہیں مگر وہ بہت بُرا لکھتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ رائٹر فاقہ کرے جب ہی اچھا لکھے گا۔ منشی پریم چند بالکل کل وقتی تھے لہٰذا وہ لکھتے رہے ساری عمر۔ اس میں کچھ چیزیں انھوں نے بہت اچھی لکھی ہیں......

شہریار:

آپ کے بہت سے افسانے بعض مقبول رسالوں میں شایع ہوئے، مگر ان میں معیار کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ آپ نے شاید اس کا اہتمام نہیں کیا کہ خاص طور پر مقبول رسالوں کے لیے

الگ سے لکھا جائے۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی، اہتمام اس لیے نہیں کیا کہ میں اس طرح تو لکھ نہیں سکتی جیسا کہ انھیں مطلوب ہے......

ابوالکلام قاسمی:

مگر بعض فکشن رائٹرز تو الگ الگ انداز کی چیزیں لکھتے ہیں اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں، کئی سال ہوئے جب یہاں علی گڑھ میں آکر ایک بزرگ خاتون افسانہ نگار نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں بیسویں صدی کے لیے دوسرے قلم سے لکھتی ہوں، شمع کے لیے دوسرے قلم سے اور ادبی اور معیاری رسالوں کے لیے دوسرے قلم سے۔

قرۃ العین حیدر:

اب یہ اپنے انداز کی بات ہے۔ میں اور دوسرے ادیبوں کے لیے کیا کہہ سکتی ہوں......

ابوالکلام قاسمی:

اچھا آپ اس سلسلے میں کچھ بتائیں کہ اس وقت جو افسانوی ادب پر غور کرنے اور اس کے لکھنے کی طرف زیادہ توجہ دی جارہی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شہریار:

ہاں تنقید کی کم مائیگی یا نقادوں کی مصلحت پسندی اپنی جگہ۔ لیکن کیا آپ کو مجموعی طور پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس وقت جو فضا ہے وہ افسانوی ادب کو سنجیدگی سے پڑھنے کی طرف مائل ہے......

قرۃ العین حیدر:

بھئی یہ بات تو میں نے آج سے کئی سال پہلے جب جامعہ میں نارنگ صاحب نے تخلیقی زبان کے استعمال پر سمینار کیا تھا، اس وقت کہی تھی۔ وہاں چار سیشن تو تھے شاعری کے اور فکشن کو فقط ایک سیشن دیا گیا تھا۔ فکشن کی طرف توجہ ہی نہیں دی گئی۔ اب ادھر پانچ چھ سال سے لوگوں نے فکشن پر لکھنا شروع کیا ہے۔ فکشن پر بات ہو اس سے کچھ لوگوں میں دلچسپی پیدا ہوگی۔ لوگ

سمجھیں گے کہ یہ بھی ایک چیز ہے جس پر لکھا جائے۔

شہریار:

اچھا صاحب، ایک سوال، میں یہ کرنا چاہوں گا کہ تاریخ میں جس طرح ادوار کا تعین ہوتا ہے تو فرض کیجیے کہ اردو فکشن کے مختلف ادوار طے ہیں، ان میں سے آپ اپنے آپ کو کس دور میں رکھیں گے۔

قرۃ العین حیدر:

میں کس دور میں؟ میں اپنے آپ کو کسی بھی دور سے منسلک نہیں سمجھوں گی......

ابوالکلام قاسمی:

آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ کہا تھا کہ ترقی پسندوں نے اپنے دور عروج میں آپ کے بارے میں لکھا کہ یہ اعلیٰ طبقے کی بات کرتی ہیں یا پسماندہ طبقے کو ان کے یہاں موضوع نہیں بنایا جاتا وغیرہ...... تو ذرا یہ بتانے کی زحمت کیجیے کہ اس تنقید کے مقابلے میں آج کی تنقید نے آپ کو زیادہ OWN کیا ہے یا نہیں یعنی آپ کی تحریروں کو زیادہ سنجیدگی سے دیکھا اور ان پر غور کیا ہے یا نہیں اور ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی اگر ایسا کرنا شروع کیا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

میں یہ بات اس لیے بھی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی تخلیقات کا پورا فریم ورک جو ہے وہ آج کے ادبی رویوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے بمقابلہ ترقی پسند تحریک کے دور عروج کے۔

قرۃ العین حیدر:

وہ تو اس لیے ہم آہنگ ہے کہ میں اس وقت بھی OUTSIDER تھی۔

ابوالکلام قاسمی:

اس وقت بھی کیوں؟ بس آپ اس وقت ہی OUTSIDER تھیں، آج نہیں ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

اچھا، بڑی عمدہ بات ہے یہ تو (قہقہہ)

ابوالکلام قاسمی:

اچھا اسی سے متعلق ایک اور سوال ہے۔ آپ نے ابھی کہا تھا کہ انسان کی مادّی زندگی ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس کی ذہنی زندگی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، تو کیا آپ یہ نہیں مانتیں کہ آج کے ادب میں یا پچھلے پندرہ بیس سال کے فکشن میں ذہنی زندگی کو بنیاد بنا کے زیادہ لکھا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بالکل......زیادہ INTELLECTUAL CONTENT آیا ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے نئے ادب کا یہ CONTRIBUTION آپ تسلیم کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

جب لوگ خارجیت سے زیادہ داخلیت کی طرف آئے ہیں تو اس میں BRAIN کا عمل تو ہوگا ہی......

ابوالکلام قاسمی:

آپ اسے صرف داخلیت کا نام کیسے دیتی ہیں۔ اس لیے کہ AFTER ALL انسان کا مقدر تنہائی ہے، بے گانگی ہے......معاشرے میں رہنے کے باوجود، تلخ حقیقتوں سے الجھنے کے باوجود اسے ہر آزمائش یا ہر مرحلہ تنہا ہی طے کرنا ہوتا ہے، انفرادی سطح پر ہی ہر چیز جھیلنی پڑتی ہے......اس طرح ذہنی زندگی خارج کا ناگزیر حصہ بن جاتی ہے، پھر جب وہ تخلیق میں اپنی ذہنی زندگی کا اظہار کرتا ہے تو پھر یہ الزام کیونکہ صرف ذات یا داخل کا اظہار ہو رہا ہے......

قرۃ العین حیدر:

میں آپ کے اس بیان سے پورے طور سے متفق نہیں ہوں۔ یعنی انسان کے مقدر کی

بات تو بہر حال ٹھیک ہے کہ وہ ULTIMATE طور پر تنہائی سے اس کا سابقہ ہے یہ تو بڑی OBVIOUS بات ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ رویہ آپ کا زیادہ EXTREME رویہ ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ انسان کے بنیادی مسائل پر اس کے معاشرے پر ملک کے اقتصادی اور سیاسی حالات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ بھی ٹھیک ہے کہ سوچنے کا جو مسئلہ ہے اس کا تعلق تنہائی سے ضرور ہے اور آج کا ادب زیادہ سوچ کے لکھا جا رہا ہے یا فکری عنصر کا اضافہ ہوا ہے۔

شہریار:

صاحب، اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے ایک شاعر جذبی صاحب نے کہا کہ شاعری تو اپنے عصری مسائل کو پیش کر رہی ہے۔ مگر افسانوی ادب جو پیدا ہو رہا ہے وہ بالکل نا قابل قبول ہے اور یہاں تک کہ مہمل ہے۔ یہ بھی کہا کہ پرانے افسانہ نگار، افسانہ نگار معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں آپ کو بھی شمار کیا۔ تو اس کی وجہ شاید ایک یہ ہے کہ ہم روز بروز پیچیدہ افسانے لکھنے کی طرف متوجہ ہوتے جا رہے ہیں؟ مثال کے طور پر ادھر آپ نے جتنے افسانے لکھے ہیں، ان کو LAYMAN بھی دلچسپی سے آخر تک پڑھے گا، ایسا نہیں ہوگا کہ وہ دو چار صفحے کے بعد اوب جائے یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس کے بہت سے LAYERS کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے لیکن وہ سمجھے گا ضرور۔ مگر ادھر تخلیقی افسانے کے نام پر جو افسانے لکھے گئے ان کو پڑھنے کی طرف بھی طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

قرۃ العین حیدر:

اس پر تو بہت بحث ہو چکی ہے۔ یہ قاسمی صاحب جو ہیں انھوں نے کل پرسوں مجھے بتلایا کہ اب تجریدیت کے سلسلے میں انتہا پسندی برائے نام رہ گئی ہے اور لوگوں میں توازن آ گیا ہے، کیوں صاحب؟ صحیح ہے؟

ابوالکلام قاسمی:

جی ہاں! میں نے عرض کیا تھا......

قرۃ العین حیدر:

مگر یہ تو دوسری بحث ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ جب آپ فیشن کے طور پر کوئی چیز لکھیں گے اس کا وہی حشر ہوگا جو ہوا............

شہریار:

ادھر یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سے افسانہ نگار جو اپنے افسانے سے تو لوگوں کو متاثر نہیں کرتے بلکہ افسانے کی سطح پر خاصے گنجلک ہیں اور COMMUNICATIVE نہیں ہیں وہ جب اپنے فن کے بارے میں بات کرتے ہیں تو بہت متاثر ہوتا ہے آدمی اور معلوم ہوتا ہے کہ واقعی انھوں نے زندگی کا سچا تجربہ کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ بہت اچھے SPEAKERS ہیں یا پھر اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے افسانوں میں رہ گئی ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

میرا خیال ہے کہ ایسے افسانہ نگاروں کی مثالیں بھی آنی چاہیے۔ نام لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مثال کے طور پر جوگندر پال ہیں۔ افسانے کے موضوع پر بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ خاصی عالمانہ بھی اور شخصی تجربے سے بھرپور بھی، لگتا ہے کہ ان کے افسانے بھی ان باتوں کی تصدیق کرتے ہوں گے، مگر ایسا نہیں ہے۔ یا پھر میرے ایک دوست افسانہ نگار ہیں شوکت حیات ان کے یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانے بہ حیثیت ایک عملی اظہار کے ان کی باتوں کا ثبوت اتنا فراہم نہیں کرتے جتنا ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے............ حالانکہ اچھے خاصے افسانہ نگار ہیں............ اچھا خیر چھوڑیئے اس بحث کو، عینی آپا! یہ بتائیے کہ جس زمانے سے آپ لکھ رہی ہیں اس کے بعد تقریباً دو پیڑھیاں اردو افسانے میں ایسی آچکی ہیں جنھوں نے آپ کے بعد لکھنا شروع کیا۔ ایک نسل تو وہ تھی جس میں سریندر پرکاش، بلراج مینرا، اقبال مجید اور خالدہ اصغر وغیرہ ہیں اور دوسری نسل وہ ہے جن کے لکھنے والے وہ ہیں جن کی عمریں

تمیں سال کے آس پاس ہیں.........کیاان افسانہ نگاروں کے بارے میں آپ ایک سینئر رائٹر کی حیثیت سے اپنی رائے دینا پسند کریں گی یا کوئی مشورہ۔

شہریار:

کم سے کم نیک دعائیں.........مگر رائے بھی۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی! میں تو اس معاملے میں سمجھتی ہوں کہ رائے تو بالکل صحیح دینی چاہیے۔لیکن ہمارے یہاں جو ایک قسم کی وہ ہوتی ہے۔اصل میں میں جس چیز کے خلاف ہوں کہ اب ہمارے یہاں اچھے اور بُرے کی پرکھ نہیں رہی۔یعنی چند افسانہ نگاروں کو ENCOURAGE کرنے کے لیے ان کی نسل نے، ان کے ساتھ کے نقادوں نے ان کی اوّلین تخلیقات کو ہی اتنا بڑھایا ان پر اتنا لکھا کہ ان کا دماغ خراب ہوگیا.........جبکہ وہ بہت ہی معمولی افسانے تھے چاہے علامتی رہے ہوں، چاہے تجریدی رہے ہوں.........میں نام نہیں لوں گی، اس لیے کہ میں کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتی کہ ابھی بچے ہیں وہ لوگ۔خیر اتنے بچے بھی نہیں ہیں بہرحال ہم لوگ اس طرح سوچ بھی نہیں سکتے تھے.........مثلاً جس وقت میں نے یا ہاجرہ، خدیجہ یا پھر اس وقت کے لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ اس وقت نقادوں کی ایک پوری جماعت بیٹھ کے ہم کو INFLATE کرتی.........ایسا ہمارے ساتھ نہیں ہوا، ہم لوگوں نے نارمل پروسس میں آگے کا سفر کیا میرے ساتھ تو بلکہ یہ ہوا کہ زیادہ تر میرے خلاف لکھا گیا۔لیکن عام طور پر ایک نارمل قسم کی پروسس تھی تنقید کی.........آپ اس وقت کے لیے کہہ سکتے ہیں کہ تنقید آتی آگے نہیں بڑھی تھی۔ پھر خاصے لوگ کہتے تھے.........اب کچھ یہ ہو رہا ہے کہ MADISON AVENUE TECHNIQUE آ گئی ہے تنقید میں یعنی آپ نے ایک نئی PRODUCT بازار میں LAUNCH کی آپ نے ایک نیا صابن کپڑا دھونے کا نکالا۔اب اس کے لیے چونکہ میں خود PUBLICITY اور ADVERTISING کا کام کر چکی ہوں آپ نے ہر طرف سے MEDIA کا استعمال کیا۔ٹیلی ویژن پر آ رہا ہے، بورڈ لگے ہوئے ہیں.........آپ نے اس کو BUILD UP کر دیا۔اچھا

BUILD UP تو کردیا، مگر پبلک میں CONSUMER نے دیکھا کہ صاحب یہ صابن کپڑے اچھے نہیں دھوتا، تو وہ DROP ہو گیا۔ اگر آپ نے اس کو اس طرح BUILD UP نہ کیا ہوتا اور وہ صابن اچھا ہوتا تو پبلک اس کو خریدتی۔ ہمارے نئے لکھنے والوں کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ ان میں سے چند کو اتنا BUILD UP کیا گیا۔ ان کی ایک دو کتابیں آئیں، انھوں نے خود اپنے بارے میں اتنا لکھا کہ وہ اس کے بعد آگے نہیں بڑھے۔ اس لیے میں کہتی ہوں کہ ہمارے یہاں اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں رہی.........دوسری چیز ہمارے یہاں انعامات ہیں۔ یہ جو ادبی اکیڈمیز انعامات دیتی ہے، ان میں کسی قسم کی اب تفریق باقی نہیں رہی۔ یعنی بُرے سے بُرے SUB-STANDARD افسانوں کے مجموعوں کو انعام مل جاتا ہے.....اچھا وہ انعام کس لیے ملتے ہیں!! اگر صاحب آپ اُردو رائٹرز کی مدد کر رہے ہیں جب بھی ٹھیک تھا۔ مگر اس طرح سے اگر آپ انعام دیں گے تو وہ ادب نہیں رہتا، وہ تو ایک قسم کی مارکیٹ کموڈیٹی بن جاتا ہے یعنی آپ نے یہ طے کر لیا کہ ہم کو اپنے پندرہ افسانہ نگاروں کو انعام دینے ہیں۔ فلاں کو دینا ہے، فلاں کو دینا ہے۔ اس کو اس سال نہیں ملا ہے اس کو بھی دے دو۔ تو اب اچھے بُرے کی تمیز نہیں رہی نا...... یہ میرا مطلب ہے..........پھر یہ بھی ہوا کہ نقادوں نے اتنے SUPERLATIVES استعمال کیے ہیں رائٹرز کے لیے کہ پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ تو پھر کوئی بات نہیں رہ جاتی نا..........

شہریار:

ایک موقع پر ایک ادیب نے کہا تھا کہ اگر واقعی ہمارے یہاں کوئی غیر معمولی ادیب پیدا ہو جائے تو اس کے لیے پھر کون سی اصطلاح استعمال کریں گے؟

قرۃ العین حیدر:

کون سی اصطلاح باقی بچے گی؟ ہر ایک جو ہے وہ عظیم ترین ہے۔ نئے ادب کا معمارِ اعظم ہے، فلانا ہے..........اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ ادب کی پرکھ کے لیے کون سی VALUES استعمال کی جائیں۔ یہ نئی نسل کے چکر میں آپ لوگوں نے یہ سب فساد کیا ہے۔ اس میں یہ بھی کوشش رہی کہ آپ ترقی پسندوں کو DOWN

کیجیے............ ماننا پڑے گا آپ لوگوں کو اس طرح کی باتوں سے ادب کا جو DEVELOPMENT ہے اسے نقصان ہوتا ہے............

شہریار:

ویسے عینی آپا! آپ کا قطع کلام ہوتا ہے جتنی بھی ادبی تحریکیں یا رجحانات آئے ہیں، انھوں نے IMMEDIATE PAST کے رجحانات کے سلسلے میں بہت ہی ناپسندیدگی کا ثبوت دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ اختلاف ہمیشہ رہے گا۔ ہر نسل اپنے ماضی قریب کی نسل سے انحراف یا انکار کرے گی۔ لیکن اس سے پوری روایت کے تسلسل میں ایسا کوئی انقلاب نہیں آجاتا۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی انکار یا انحراف کرو لیکن خود بھی تو کوئی چیز SUBSTANTIAL ہی دو۔

شہریار:

ظاہر ہے کہ ادب کے کاروبار میں توازن بہت مشکل ہے۔ اس میں انتہاپسندی تو آجاتی ہے مگر یہ بھی ہوتا کہ جب کوئی نیا رجحان آتا ہے تو پرانے لوگ شک وشبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہم تو کسی کو شک وشبے کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ چیز کیا ہے اور بنیادی بات یہی ہے۔ آپ نے کیا لکھا ہے۔ مجھے اس سے مطلب نہیں کہ آپ کس Age Group کے ہیں۔ آپ نے 1980 میں لکھنا شروع کیا یا 1970 میں یا 1960 میں۔ بنیادی چیز یہ ہونی چاہیے کہ افسانہ جو لکھا جا رہا ہے وہ کیسا ہے۔ جس شخص نے بھی وہ افسانہ لکھا ہو، افسانہ کیسا ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

ایک زمانے کے ادب کے بارے میں آپ کے اور ہمارے درمیان اختلاف ہونا بالکل فطری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی ادب کو دیکھنے کے دو زاویہ نظر ہو سکتے ہیں۔

شہریار:

جس زندگی سے ہم گذر رہے ہیں اس کے سلسلے میں آپ کے نقطۂ نظر کو ضروری نہیں کہ

ہم تسلیم کرلیں۔اس لیے یہ اختلاف رہے گا۔

قرۃ العین حیدر:

اختلاف رہنے کو میں نہیں کہتی ہوں۔ میں صرف یہ کہتی ہوں کہ جو NORMS ہیں تنقید کے ان میں تھوڑی سی احتیاط برتنی چاہیے۔تعریف کے معاملے میں یا کسی کو CONDEMN کرنے کے معاملے میں......

شہریار:

صاحب، اگر ہم ترقی پسند تنقید کی ابتدائی تحریروں کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ کتنی جارحانہ تنقید لکھی ہے ان لوگوں نے غالبؔ کے بارے میں، میرؔ کے بارے میں، اقبالؔ کے بارے میں۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں خاص طور پر اقبال کے بارے میں۔

ابوالکلام قاسمی:

صرف اقبال وغیرہ کی بات نہیں صاحب، زیادہ تر بڑے شاعروں کو، افسانہ نگاروں کو رجعت پسند کہا گیا۔اقبال وغیرہ کی بات تو سمجھ میں بھی آتی ہے خود فیضؔ کی شعریت اور تہہ داری کو عرصے تک موردِ الزام قرار دیا جاتا رہا۔فکشن لکھنے والوں میں منٹو اور بیدی تک ہدفِ تنقید رہے......... آپ (قرۃ العین حیدر) کے سلسلے میں جو رویہ رہا وہ ہم سب جانتے ہیں.......... دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کے سارے جینوئن رائٹرز کے بارے میں اپنے پرانے بیانات کے حوالے کے بغیر اس وقت چپکے سے رائے تبدیل کرلی گئی جب یہ سب روایت کا حصہ سمجھے جانے لگے۔

شہریار:

اور اپنے شاعروں کو جو نئے نئے پیدا ہوئے تھے ان میں عظیم سے کم تو کوئی تھا ہی نہیں..... مگر آج کی تنقید کو دیکھیے کہ عظیم کہنے میں اب خاص احتیاط برتی جاتی ہے۔ایک آدھ کسی نے حماقت سے عظیم وغیرہ کہہ دیا ہو تو یہ الگ بات ہے۔

قرۃ العین حیدر:

مگر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ ترقی پسندوں نے ادب کی پوری کایا پلٹ دی وہ چیز اس وقت نہیں ہے۔ جیسے آپ لوگ کہتے ہیں کہ آج کے ادیبوں نے یہ کیا۔ ایک نیا ڈائمنشن دیا.......... میں مانتی ہوں یہ باتیں۔ لیکن یہ تجربے جو تھے، اس طرح کے تجربے پہلے بھی ہوئے تھے۔ ترقی پسندوں نے کافی تجربے تکنیک کے کیے ایسی بات نہیں ہے کہ وہ سارے کے سارے SOCIALIST REALISM کر رہے تھے۔

شہریار:

کوئی نئی چیز تو ہر جگہ ہوتی ہے مگر ہم غالب رجحان کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

رجحان کیسا بھی رہا ہو مگر اس وقت کے افسانے بہت پاورفل تھے..........: اچھا ایک کام کریں، آپ چند افسانے نکال کے رکھیے میرے سامنے منٹو سے لے کر آج تک کے، اور آپ مجھ سے یہ کہیں کہ دس افسانے بہترین جو لگیں آپ کو ہر لحاظ سے، محض تاثرات سے نہیں بلکہ فنی طور سے تو مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان سارے افسانوں میں منٹو سے لے کر آج تک زیادہ تر افسانے جو چنیں گے (مجھ سمیت) وہ اتفاق سے اسی وقت کے افسانے ہوں گے۔

شہریار:

صاحب، اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ یہ تو گروپ کا فرق ہو سکتا ہے، مثلاً آپ چنیں، اور ابوالکلام قاسمی چنیں تو بہت فرق ہو جائے گا اور اس کا جواز ہوگا۔

ابوالکلام قاسمی:

یقیناً یہ فرق ہوگا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ بہت ممکن ہے میرا انتخاب اس سے بالکل مختلف ہو اور میرے منتخب کردہ افسانوں میں بیش تر کا تعلق آج کے لکھے جانے والے افسانوں سے ہو اور یہ بات بغیر کسی معقول وجہ کے نہیں ہوگی۔

قرۃ العین حیدر:

میں بالکل LATEST، افسانوں کی بات کر رہی ہوں جو ادھر لکھے گئے ہیں۔ تجریدی 1960 کے بعد کے۔ ان میں کتنے افسانے OUTSTANDING لکھے گئے ہیں۔

ابوالکلام قاسمی:

میرے خیال میں اگر ایسا کوئی جائزہ لیا جائے تو وہ ادوار کی تقسیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں خراب افسانے بھی یقیناً لکھے گئے اور خاصے لکھے گئے ہیں مگر اسی تناسب سے بہت اچھے افسانے بھی بڑی تعداد میں لکھے گئے ہیں۔ پھر یہ کہ آج افسانوں میں تنوع بہت زیادہ ہے، جو ایک اچھی علامت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے ایسا ضرور ہوگا، آپ کی رائے صحیح ہے۔ مگر وہ جو ایک CREATIVE OUT BURST اس طرح کی یا اس پیمانے پر اس وقت CREATIVE WRITING نہیں ہوتی۔ یہ آپ کو ماننا پڑے گا۔

ابوالکلام قاسمی:

ہم آپ کی بات یقیناً مانتے ہیں کہ جو آپ نے ابھی کہی تھی کہ ترقی پسندوں نے بالکل کایا پلٹ دی۔ یہ تو بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

آپ لوگوں میں ایسا مذہبی قسم کا تعصب کیوں ہے؟ (قہقہہ لگاتے ہوئے)

ابوالکلام قاسمی:

صاحب، ہم تو آپ کی تائید کر رہے ہیں......

شہریار:

دیکھیے صاحب، اگر آپ اس PERIOD کے افسانوں کا انتخاب کیجیے تو اس وقت بھی غیر ترقی پسند افسانے آپ کو زیادہ اچھے ملیں گے۔ منٹو کے افسانے آپ کو مل جائیں گے، غلام عباس

کے افسانے، آپ کے افسانے مل جائیں گے،

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے اختر حسین رائے پوری، فیاض محمود، بھئی اچھے اچھے افسانے لکھ گئے ہیں یہ لوگ..........لوگ تو محمد حسن عسکری کو بھول گئے۔

شہریار:

دیکھیے، عام صورت حال اور DISILLUSIONMENT کے زمانے میں فرق ہوتا ہے۔ اس وقت ایک خواب تھا، ایک IDEALISM تھا..........اس وقت اقدار کا اس طرح سے کوئی مجموعہ ہمارے پاس نہیں ہے......

قرۃ العین حیدر:

میں تو اس معاملے میں بہت POSITIVE THINKING کی آدمی ہوں۔ پھر جو بات آئے گی وہ آپ لوگ مانیں گے نہیں......وہ بات ہے سیاست کی، کہ فلسطینیوں سے زیادہ DISILLUSIONED کون قوم ہو سکتی ہے؟ ہم تو اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں۔ نہ ہم مارے گئے، نہ ہم پر بمباری ہوئی......وہ کس طرح لکھ رہے ہیں؟

ابوالکلام قاسمی:

افسوس کی بات تو یہی ہے کہ ہم تو اپنی صورت حال سے خود کو وابستہ بھی محسوس نہیں کرتے، اس کے اسباب کچھ سیاسی اور سماجی ہیں اور کچھ تاریخ کا جبر۔

شہریار:

یعنی نوجوانوں کے لیے آئیڈیلزم فراہم کرنے والی کوئی ایجنسی موجود نہیں ہے، چاہے فلسفے کی سطح پر ہو چاہے سیاست کی سطح پر..........کوئی حلقہ یا کوئی گروپ ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ معلوم ہو کہ یہ حق کے لیے جدوجہد کر رہا ہے......

قرۃ العین حیدر:

صاحب یہ صحیح ہے، مگر آپ اپنے DISILLUSIONMENT کو CELEBRATE تو

نہ کیجیے۔

شہریار:

CELEBRATE کون کررہا ہے؟

ابوالکلام قاسمی:

میں آپ کو آپ کے ہی ناول، ''آخرِ شب کے ہم سفر''، کا حوالہ دوں گا کہ مثال کے طور پر آپ نے جس طرح ریحان الدین احمد وغیرہ کے کردار کو پیش کیا ہے، ہم جب اپنے بزرگ ادیب اور ادب کو دیکھتے ہیں تو اس طرح کی زندگی اور اس طرح کے لوگ ہمیں نظر آتے ہیں کہ کچھ وہ لوگ جو باغی تھے وہ جو احتجاج کرنے نکلتے تھے، وہ لوگ جو تبدیلی چاہتے تھے......وہ سب کے سب سمجھوتہ کیے بیٹھے ہیں، انعام واکرام کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی میں نے بھی تو اس پورے گروپ، اس پورے پیریڈ کے بارے میں لکھا ہے۔ ریحان الدین احمد تو پورے دور کا SYMBOL ہے۔ اس پورے بوگس انقلابی کا، جس نے کہ واقعی انقلاب کے لیے کام بھی کیا اور بعد میں COMPROMISE کرلیا۔

ابوالکلام قاسمی:

لیکن آپ یہ بتلائیں کہ ایسے لوگوں کا حشر دیکھنے کے بعد اس کے بعد کی نسل میں DISILLUSIONMENT پیدا ہوگا یا نہیں؟

قرۃ العین حیدر:

لیکن وہ نسل اتنی DEFEATIST کیوں ہے، وہ خود کیوں نہیں کرتی کوشش، آپ تو پورے SETUP کا حصہ ہیں، تو اس جگہ آکر میں آپ لوگوں سے AGREE نہیں کرتی ہوں کہ آپ تنہا ہیں لکھتے رہیے۔ بھئی آپ تنہا ضرور ہیں مگر تنہا اس لیے کہ ان حالات نے آپ کو تنہا کیا ہے۔

شہریار:

صاحب، یہ تنہائی جو ہے وہ PROTEST کی شکل میں ہے۔ یہ تنہائی POSITIVE

شکل میں نہیں ہے؟ یہ تو ایک طرح کی للکار ہے۔ یعنی معاشرے کو للکارا گیا ہے کہ اس تنہائی کے ذمہ دار تم ہو۔ مثال کے طور پر کفن افسانہ کو دیکھیے جو بہت ہی بھیانک معلوم ہوتا ہے، عجیب و غریب بے حسی سے ہمارا سامنا ہوتا ہے، مگر یہ جیسے متاثر کرتا ہے دوسری طرح کا افسانہ نہیں کرتا۔

قرۃ العین حیدر:

آپ کو معلوم ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے ایک گلف عرب نوٹوں کی گڈی لیے کھڑا تھا، ایک غریب عورت وہاں تھی۔ اس کا بچہ اس کے پاس تھا، کوئی پانچ سال کا بچہ، اس عرب نے کہا کہ تم کو سو روپے کا نوٹ دیتا ہوں، یہ موٹر آ رہی ہے، اس بچے کو اس کے سامنے کھڑا کر دو کہ موٹر اس سے ٹکرا کر نکل جائے......اور اس عورت نے وہی کیا تو ایسے سماج میں جہاں یہ سب ہو رہا ہے، آپ کیا کر سکتے ہیں......

شہریار:

اس کا ایک رد عمل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے سماج کے خلاف احتجاج کرو، مختلف طریقوں سے۔

ابوالکلام قاسمی:

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں احتجاجی ادب لکھا نہیں جا رہا ہے۔ جبکہ ساری دنیا میں، خود ہندستان کی دوسری زبانوں میں PROTEST کا ادب بڑے پیمانے پر تخلیق ہو رہا ہے......

قرۃ العین حیدر:

بھئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اُردو نے ہمیشہ احتجاج کا ادب پیدا کیا، آج سے نہیں ہمیشہ سے، یعنی احتجاج اُردو کی گھٹی میں پڑا ہے مگر آج اردو کا ادیب ہے خصوصاً ہندستان کا، وہ احتجاجی ادب نہیں پیدا کر رہا ہے۔

شہریار:

سرحد کے اس پار جو چیزیں لکھی جا رہی ہیں ان میں POLITICAL TOUGH ہوتا ہے نسبتاً زیادہ۔

قرۃ العین حیدر:

ارے خوب ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ زیادہ ALLEGORY میں چلے گئے ہیں، انتظار حسین کا ناول بستی، کیا ہے یا، خوشیوں کا باغ، کیا ہے؟

ابوالکلام قاسمی:

حد یہ ہے کہ جو چیزیں وہاں نہیں چھپ پاتیں وہ ہندستان میں چھپ رہی ہیں، کسی نہ کسی طرح۔ مگر ہم تو اپنے معاشرے کے پورے عمل میں خود کو شریک ہی نہیں سمجھتے۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ ہم الگ تھلگ کر دیے گئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی انور سجاد بھی تو آپ کا ایک موڈرن رائٹر ہے۔ لیکن وہ بالکل پروٹسٹ کا ادب لکھ رہا ہے۔

شہریار:

ہم کسی موضوع کے خلاف نہیں ہیں۔ یعنی چونکہ یہ پروٹسٹ کا ادب ہے، اس لیے اچھا ہے۔ ایسا نہیں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں، پروٹسٹ کا ادب بھی بہت بُرا لکھا جاتا ہے لیکن یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ لوگ لکھ رہے ہیں......

ابوالکلام قاسمی:

بات بہت پھیل جائے گی اگر اب موضوع اور وسیلے کی بات شروع کی جائے گی لیکن ضرور ہے کہ ہم میں سے کوئی پروٹسٹ ادب کے خلاف نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

کم سے کم یہ تو ہے کہ ان کے پاس باتیں ہیں کہنے کے لیے۔

شہریار:

صاحب، صرف باتوں سے تو کبھی ادب بڑا نہیں ہوا۔

قرۃ العین حیدر:

تو پھر کا ہے سے ہوا ہے؟ محض تکنیک سے؟؟

شہریار:

نہیں نہیں۔

ابوالکلام قاسمی:

وہ بھی ہے، مگر اس کو بھی دیکھنا چاہیے کہ ان باتوں کو فنی تقاضوں کے ساتھ کامیابی سے پیش بھی کر پاتے ہیں یا نہیں؟ دونوں کی ہم آہنگی کے بعد ہی فن کی بحث شروع ہوتی ہے اور اس پر قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے......

قرۃ العین حیدر:

یہ دونوں باتیں.......... ایک شخص فنی طور پر کامیاب بھی ہے اور کچھ کہہ بھی رہا ہے۔ آپ لوگوں نے دونوں باتیں صحیح کہی ہیں...... لیکن اردو میں خاموشی جو ہے وہ واقعی بڑی حیرت انگیز ہے۔

ابوالکلام قاسمی:

خیر اب گفتگو کا سلسلہ ختم کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ بات چیت نہایت کارآمد رہی، عینی آپا آپ کا بہت شکریہ.......... شہریار صاحب، آپ کا بھی شکریا۔

قرۃ العین حیدر:

یہ تو بہت طویل گفتگو رہی...... بہت خوب......

('شعر و حکمت' شمارہ 1، 1987)

نقادوں نے فکشن کو سراسر نظر انداز کیا ہے

گفتگو : سکرینا پال

سکرینا:

تخلیقی فن کار کے ساتھ ایک مسئلہ "تنہائی" کا ہے۔ فلسفیوں اور ادبی نقادوں نے اس نمائندہ موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی اور سوچا بھی ہے۔ میں اس حوالے سے آپ کی توجہ چاہوں گی اس خاص شعور تنہائی کے موضوع پر جس کا تجربہ آپ کو اس لیے ہوا ہوگا کہ آپ خود تخلیقی فنکارہ بھی ہیں اور ہندستان میں رہتے ہوئے اردو سے استفادہ کرتی ہیں۔ یہاں اس زبان کے امکانات محدود ہیں اور قارئین کی تعداد بھی کافی کم ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں آپ کچھ زیادہ اجنبیت محسوس کرتی ہوں گی۔ اس بارے میں آپ کے احساسات میرے خیال میں قابل توجہ ہوں گے اور یہ کہ آپ خود اس صورت حال کو کس طرح محسوس کرتی ہیں کیا آپ نے اس موضوع پر سوچا ہے اور یہ کہ اس صورت حال کا کوئی قابل ذکر تجربہ آپ کی زندگی میں ہوا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

آپ نے ایک ہی تسلسل میں دو سوال پوچھ ڈالے ہیں ان میں سے ایک کا تعلق تخلیقی قلم

کار کی "تنہائی" سے ہے۔ پہلے ہمیں اسی سوال سے نپٹ لینا چاہیے کیونکہ تنہائی ایک مسئلہ بھی ہے اور ایک موضوع بھی ہے، صرف یہاں نہیں دنیا میں ہر جگہ ہے۔ ادیب لکھتے ہوئے بالکل تنہا ہی ہوتا ہے البتہ مغرب کے ادیب کی تنہائی کے ساتھ ایک سماجیاتی تناظر بھی ہے۔

سکرینا:

جی لیکن اس پر تو بعد میں باتیں ہوں گی۔

قرۃ العین حیدر:

آپ بجا فرماتی ہیں ابھی اس سے ہمارا واسطہ نہیں ہے۔ آپ نے ایک اور بھی نکتہ تلاش کیا ہے یعنی ایک خاتون ادیبہ کی تنہائی۔ خاتون ادیبہ خواہ مغرب سے متعلق ہو یا ہمارے یہاں سے وہ ایک ہی جیسی صورت حال سے دوچار ہوتی ہے۔ یہاں صورت حال نسبتاً زیادہ خراب ہے۔ پھر آپ نے اردو کی خواتین لکھنے والیوں کی تنہائی کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ اس صورت حال کی گمبھیرتا میں اور اضافہ کر رہا ہے مگر معاملات اتنے خراب بھی نہیں ہیں۔ ہندستان میں اردو کے ذریعہ اظہار میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ آپ کناڈا یا پاکستان یا کسی جگہ بھی رہے ہوں اور اردو میں لکھتے ہوں صورت حال جو ہے وہی رہے گی۔ بالکل اسی طرح ہندستان کی خواتین اور مرد اہل قلم بھی جو اردو میں لکھتے ہیں اسی کشتی کے سوار ہیں جیسا کہ آپ کو علم ہے۔ ہندستان میں تو خواتین پچھلے سو سالوں سے اردو میں لکھ رہی ہیں جس زمانے میں یہاں پہلے مرد نے ناول لکھی تھی اسی زمانے میں ایک عورت نے بھی پہلی ناول تخلیق کی تھی اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا ایک ادیبہ جو بھی لکھ رہی ہے خود آگاہ (SELF CONSCIOUS) ہے۔ یہ مسئلہ بھی دنیا کی تمام خواتین اہل قلم کے درمیان مشترک ہے۔

سکرینا:

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ثقافتی تناظر میں فرق کی وجہ سے مشرق و مغرب کے درمیان تنہائی جیسے مسئلے پر اختلاف موجود ہے۔ ثقافتی تناظر کے مسئلے کو ہم نظر انداز کر بھی نہیں سکتے ہیں۔ جارج ایلیٹ اور برانٹے بہنوں نے انیسویں صدی کے انگلستان میں خواتین اہل قلم کے تعصبانہ انداز فکر

سے بچنے کے لیے خود کو مرد کے روپ میں پیش کیا گویا ان کو اپنی جنس پر پردہ ڈالنا پڑا۔ پندرہ بیس سال پہلے تک ہندستان میں بھی بالکل یہی صورت حال تھی خود آپ کو اس کا تجربہ ہوگا کہ چند سال قبل آپ کی تخلیقات پر تنقید کرنے والے یہ سوچتے تھے کہ آپ خاتون ہیں اور اس کے نتیجے میں آپ کو بھی ''عرفان ذات'' کا تجربہ ہوا ہوگا اور پھر آپ نے لکھنے کے دوران اپنے ہی کسی تخلیقی حوالے سے یا کسی ایک واقعہ کو منتخب کرتے ہوئے اس سے نجات حاصل کی ہوگی۔

قرۃ العین حیدر:

اول تو یہ بات کچھ کم قابل توجہ نہیں کہ اردو ادب میں خواتین اور مردوں کے درمیان مغائرت کبھی نہیں رہی۔ حالانکہ یہاں کے سماجی تناظر میں اس کے امکانات بہت واضح تھے کیونکہ اس کا تانا بانا اسی مغائرت سے بنا تھا، ہمیں اس مخصوص رویے کو سمجھنے کے لیے اس کی اصل سے رجوع کرنا ہوگا۔ اردو میں مرد اور خواتین فکشن اور شاعری لکھتے رہے ہیں۔ ایک دور ایسا تھا جب خواتین اہل قلم کے بارے میں ذرا متعصبانہ طرز فکر اختیار کیا گیا تھا اور اسی زمانے میں دنیا کے دوسرے علاقوں کی صورت حال بھی ایسی ہی تھی۔ حقیقت یہ ہے ہمارے یہاں یہ رجحان اتنا واضح کبھی نہیں رہا کہ خواتین اہل قلم کو اس کا احساس ہوتا۔ میری اپنی والدہ نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں قلم اٹھالیا تھا لیکن ان پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا حالانکہ ایک ایسی عورت پر یہاں کے سماجی ماحول کے اعتبار سے اعتراض ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ پردے سے باہر آگئی تھی۔ خواتین ناول بھی لکھتی رہیں اور رومانی کہانیاں بھی جہاں تک میرا اپنا مسئلہ ہے میری تشویش کی وجہ 'عرفان ذات' نہیں ہے بلکہ اردو نقادوں کا عام رویہ ہے جو ان جزئیات پر توجہ نہیں کرتے جو فکشن میں نظر آتی ہیں۔ نقادوں نے تو فکشن کو سراسر نظر انداز کیا ہے اور فکشن کا شعبہ سنجیدہ تنقیدی مطالعے سے محروم رہا ہے۔ اپنے بارے میں بھی مجھے نقادوں سے یہی گلہ ہے۔

سکرینا:

گویا ایک ادیبہ کی حیثیت سے آپ کو اچھی طرح احساس ہے کہ آپ کی تخلیقات کا مناسب انداز میں اعتراف نہیں کیا گیا ہے اور اگر ایسا ہوا تو ایسے اسباب ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ

سکتے ہیں نقادوں کی نظر غیر سنجیدہ نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں بالکل! ایسا ہی ہے۔

سکوریتا:

تو کیا آپ نے اس صورت حال میں خود کو علاحدہ یا اجنبی محسوس نہیں کیا؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں ہرگز نہیں۔ میں تنہائی پسند نہیں ہوں اور نہ تنہائی کا واویلا میرا مسئلہ ہے۔ میرے لیے اہم مسئلہ یہ ہے کہ میری تخلیقات فعال اور زندہ ادبی لین دین کے معاملے میں نمایاں کردار ادا نہیں کر سکیں ان کی طرف سے عموماً ایک طرح کی لاپرواہی برتی گئی ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہ لیجیے کہ مجھے نقاد کی ضرورت ہے۔

سکوریتا:

یعنی ادیبہ کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے۔

قرۃ العین حیدر:

جی اور نہ میں نقادوں کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت محسوس کرتی ہوں بس فکشن کو نظر انداز کرنے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے وہ بُرا معلوم ہوتا ہے۔

سکوریتا:

تو کیا آپ کے خیال میں اس طرح کہانی کار کی تخلیقی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یقیناً غلط انداز نظر۔ گروہی ذہنیت وسیاست نے جو غیر معیاری اور کمزور ادب کے فروغ کا سبب ہے، بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اپنے مضامین اور اپنی گفتگو میں بارہا میں نے ایسے نمایاں ومشترک کہانی کاروں کے حوالے دیے ہیں۔ بہتوں نے تو ان کا نام سنا بھی نہیں ہے کسی نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ تھے کون؟ انھوں نے کیا لکھا وغیرہ۔ اردو میں یہ رجحان بھی

غالب ہے کہ ایک شخص کسی ایک ادیب سے وابستہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک نقاد ہے جو خود کو پریم چند کے لیے وقف کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان پر مہارت حاصل کر رہا ہے پھر وہ مسلسل ان کے کرداروں، ان بیلوں اور دیہاتوں کے بارے میں جو ان کی کہانیوں کا موضوع ہیں لکھتا رہتا ہے۔ ادب میں اس کے لیے باقی سب کچھ ثانوی ہوگا اسی طرح خود کو اقبال کے لیے وقف کر دیتا ہے اور کوئی جدید شاعری کے لیے میں اس کو سہل پسند کہتی ہوں۔

سکریتا:

آپ کے خیال میں کیا ایسا نہیں کہ ہم اس رجحان کی تشریح ہندستانی سوسائٹی کی پیچیدگی کو سمجھنے کی کوشش سے کریں جہاں ہر بڑا ادیب بجائے خود ایک قسم (CATEGORY) بن جاتا ہے۔ اس قسم کے تضادات کا سبب اس سوسائٹی کے تناظر کی رنگارنگی اور مختلف جہتیں ہیں جو اس کو قیمتی روایات اور ورثے کے طور پر ملی ہیں جہاں ایک طرف تو صدیوں کے مذہبوں اور ثقافتوں کے گوناگوں مظاہر ہیں اور دوسری طرف بے حد ترقی یافتہ اور تکنیکی ملبوس رکھنے والی جدید تہذیب ہے۔ مغرب میں ایسی تحریکات اور قسموں کی کمی نہیں ہے جو لکھنے والوں کی جماعت بندی کر دیتی ہے یعنی قدامت پسندی اور فطرت پرستی وغیرہ۔ ظلم کا ادب بے زبان ادب اور اسی طرح جبکہ لکھنے والوں کی اس طرح جماعت بندی بے حد مشکل ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہو سکتا ہے لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہوں گی وہ یہ کہ یہاں کی تنقیدی تحریروں میں انفرادی اور اصل تفکر کا فقدان ہے۔ ان تحریروں میں بہت زیادہ دہرانے والی کیفیت ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے لفظ الف کو دہرا سکتی ہوں جو کہ 1936 میں ترقی پسند تحریک نے شروع کیا تھا۔ اب تک ترقی پسند نقاد تنقید کے نام پر تبصرے ہی لکھ رہے ہیں جن کی حیثیت کم و بیش جائزوں کی ہے۔ ان کی فکر الجھی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ تنقید میں کوئی ایسی چیز پیش نہیں کر سکے جو قابل ستائش کہی جائے۔ مثلاً جس موضوع پر ان ادیبوں نے دس سال پہلے بہت کچھ لکھا تھا آج وہی ادیب خود اپنے نقطہ نظر کی مذمت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے فرض کر لیا ہے کہ اردو افسانے

میں بہت بڑا انقلاب آ گیا ہے اور اس لیے ماضی کے تمام افسانوی سرمایے کو احمقانہ اور پس ماندہ کہہ کر مسترد کر دیا۔ بہت سی غیر معیاری کہانیوں کے بارے میں کہا گیا کہ ان میں فکری گہرائی ہے حقیقی اندرونی زندگی کا انعکاس ہے وہی نقاد جنھوں نے اپنے دور میں ادبی تحریروں کی ایک قسم کی ہمت افزائی کی اب اس کی مذمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ واضح اندازِ فکر کا فقدان رہا ہے اور غالباً تنقید کی کوئی واضح اور ترقی یافتہ صورت نہیں رہی۔

سکرینا:

آیئے تو اب ہم بحث کے لیے ایک اور موضوع کی طرف آئیں۔ یہ بات تو طے شدہ حقیقت ہے کہ آپ کے والد سید سجاد حیدر یلدرم خود بھی ایک مستند افسانہ نگار تھے جنھوں نے جدید تکنیک اور تناظر کی آمد سے پہلے رواجی اسلوب میں لکھا تھا۔ ایک نسل کے بعد آپ نے جو طویل مختصر کہانیاں لکھیں وہ اسلوب کے اعتبار سے بہت مختلف تھیں۔ کیا آپ اس سے اتفاق کریں گی کہ ادب میں ترقی ہوئی ہے اور آپ نے افسانہ کے سفر کو آگے بڑھایا ہے؟ یا پھر یہ اس لیے ہوا کہ کس طرح ادیب اپنی انفرادی صداقت سے برسرِ پیکار ہوتا ہے اور اپنے افسانوی تجربے کو اپنی ہی انفرادی قسم کی افسانوی صورت میں پیش کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں بلاشبہ ادب میں ترقی ہوئی ہے اور جس کا سبب انسانی ذہن کا ارتقا ہے۔ مثلاً حقیقت کے تصور کی فلسفیانہ سطح پر تلاش یا نظریہ اضافیت کی دریافت وہ ادیب جو ان فکری انکشافات سے پہلے لکھ رہے تھے ان کا نقطہ نظر دنیا کے بارے میں کچھ اور تھا۔ علم و آگہی کا عمومی ارتقا ادیب کے شعور احساس میں تبدیلی پیدا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ میرے والد کے دور کی نسل ٹائی سن کا مطالعہ کرتی تھی جبکہ میرے دور کی نسل نے ٹی ایس ایلیٹ کے عہد میں آنکھ کھولی ہے۔ اس سے بھی بہت فرق نہیں پڑتا۔ عظیم ادب ہمیشہ ہی عظیم رہے گا خواہ کسی دور میں تخلیق ہوا ہو جیسا کہ ہیزلٹ (HAZLITT) کہتا ہے کہ لکھنے والا اپنے عہد کی روح کو گرفت کرتا ہے اس کو یہ سروکار نہیں کہ تکنیک کیا ہو۔

سکرینا:

ان دنوں حقیقت کی مختلف سمتوں کی توضیح وتشریح کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ ذرائع موجود ہیں اور لکھنے والا تخلیقی اظہار کے لیے نئے اسالیب دریافت کر لیتا ہے بعض مغربی لکھنے والوں مثلاً سیمول بکٹ(SAMVEL BECKETT) کے فریسٹریشن کی طرف رجوع کرنا چاہوں گی جس نے تخلیقی تجربے کے اظہار میں زبان کی تنگ دامنی کا ذکر کیا ہے یہ بات اس نے انگریزی زبان کے لیے کہی، ہے جس میں لسانی سائنس کی رو سے بہت ترقی ہوئی ہے۔اردو پر ہمارے علما نے اس حوالے سے کوئی توجہ نہیں دی ہے۔انگریزی زبان نے انسانی سائیکی کے ساتھ ساتھ ارتقائی سفر طے کیا ہے اس کے باوجود یا اس کی وجہ سے الفاظ کے دھماکے (EXPLOSION OF WORDS) اور زبان کے انقلاب کی بنا پر بعض لکھنے والے خاموش ادب کی طرف رواں دواں ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ میرا مسئلہ بالکل نہیں ہے۔اردو تو بہت وسیع اور مضبوط زبان ہے اس میں ہر لفظ کے ساتھ معنوں کی بے انتہا سمتیں ہیں۔میرے لیے تو یہ بھی نہیں ممکن کہ اظہار کے کسی ایک لہجے سے فرد کو مربوط رکھ سکوں۔میرے لیے جو بات وجہ تشویش ہے وہ زبان کے استعمال کا بتدریج زوال ہے۔میں زبان کی صنعائی کے بارے میں پریشان ہوں کیونکہ حسن اسی صنعائی کے اندر موجود ہے جب میں دوردرشن پر بے تکی ہندی زبان سنتی ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ ہندی بھی حسین زبان ہے۔دوردرشن اس کا حسن بھی ملیامیٹ کردیتا ہے اور بلا جواز موسم پہنچاتا ہے جیسے فقرے استعمال کرتا ہے ظاہر ہے کہ یہ انداز زبان کی جمالیات کے منافی ہے۔میں زبان کی تنگ دامنی محسوس نہیں کرسکی اور پوری سنجیدگی سے کہہ سکتی ہوں کہ اردو زبان میں لفظی سرمائے کی کمی نہیں ہے۔

سکرینا:

اس سے لسانی نظریہ سازوں کو ایک موضوع مل سکتا ہے اور اس کی مدد سے وہ زبان کی

صفائی برقرار رکھنے کے لیے زبان کی سائنس دریافت کر سکتے ہیں۔ بہرحال اردو زبان کی توانائی اور حرکت کے بارے میں آپ کے خیالات وجہ مسرت ہیں۔ آپ کی چند تخلیقات خصوصاً ''آگ کا دریا'' کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات لائق توجہ ہے کہ آپ کے یہاں تاریخ کے ادراک کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ آپ نے وقت کے بہت بڑے تناظر کا احاطہ کیا ہے اور اس دور کے ناول کو تاریخ کی گہری بصیرت سے روشناس کرایا ہے۔ مجھے بتایئے کہ جب آپ مختصر افسانہ لکھتی ہوتی ہیں تو کیا کسی بھی طرح خود کو محدود یا بندھی ہوئی محسوس کرتی ہیں کیونکہ مختصر افسانے کی ہیئت لکھنے والے کو وقت کے اتنے بڑے وسیع تناظر کے بیان سے روکتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ایسا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اکثر میری کہانیاں وقت کے بڑے اور وسیع تناظر کا احاطہ کرتی ہیں بعض تو ایک کردار کی پوری زندگی پر محیط ہیں اور بعض خاندان کی زندگی پر محیط ہیں یہ کہانیاں زندگی کے دور سے تعلق رکھنے والے مختلف مراحل کا احاطہ کرتی ہیں کسی چھوٹے جزو کا نہیں۔

سکرینا:

آپ کی ناولیں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ناول لکھنے میں آپ زیادہ سہولت اور آسودگی محسوس کرتی ہیں پھر وہ کون سے محرکات ہیں جن کے تحت آپ مختصر افسانے کی ہیئت کا انتخاب کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں یہ سب نظریے کا مسئلہ ہے اور مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم اس لیے لکھتے ہیں کہ ہمارا لکھنے کو جی چاہتا ہے لکھنے کا خیال اور احساس پیدا ہوتا ہے۔

سکرینا:

لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والا شعوری طور پر اس ہیئت کو جس کا اس نے انتخاب کیا ہے فکری طور پر سمجھنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہوسکتا ہے کچھ ایسا کرتے ہوں لیکن میں نہیں کرتی۔ تاریخ میری دلچسپی کا موضوع ہے۔ اپنے ناولوں اور افسانوں میں تاریخ سے استفادہ کرتی ہوں۔

سکرینا:

تاریخ کی معدومیت (ANNIHILATION OF HISTORY) کے نقطہ نظر پر آپ کی کیا رائے ہے جو کہ تاریخی شعور سے حال کو مکمل طور پر علیحدہ کردینے کا حوالہ پیش کرتا ہے اور امیج کی نمایاں افادیت کو جو مصنف پیش کرتا ہے نظر انداز کرنے کی رائے دیتا ہے۔ اس کو جدید رویے کا نام دیا جارہا ہے۔ ایلین روب (ALAIN ROBBE) کی تخلیقات ان رجحانات کی مثال ہیں جہاں ادیب امیج اور قاری کے درمیان مداخلت کی کوئی کوشش نہیں کرتا ہے ہیئت کی یکسانیت و موزونیت امیجز کے تسلسل سے تخلیق پاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اس قسم کی تمام تکنیک اور نظریے میرے لیے بے معنی سے ہیں۔ میں جن چیزوں کے بارے میں جو کچھ محسوس کرتی ہوں لکھ دیتی ہوں۔

سکرینا:

ہم دراصل اس چیز کی تلاش میں ہیں جس سے آپ کو دلچسپی ہے اور یہ کہ آپ کا اپنا نقطہ نظر کس طرح دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ بھی کہ تکنیک اور خیال ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اس لیے کہ ایک پہلو کا انعکاس دوسرے پہلو کی بہتر تفہیم کے لیے راستہ فراہم کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں بار بار بہت سے لوگوں کو بتاتی رہی ہوں کہ جب ہم لکھنے بیٹھتے ہیں تو تکنیک خود بخود وارد ہوتی ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ لکھنے والا اس پر پہلے سے سوچے۔ ایک موسیقار کے ساتھ تو یہ مشکل ہے کہ ایک راگ کے لیے خواہ وہ تکنیک میں کوئی بھی تبدیلی کرے بنیادی اصولوں سے انحراف ممکن نہیں لیکن میرے لیے یہ مشکل نہیں ہے۔ کوئی بھی مختصر سا منظر یا کوئی امیج جو میری

یادوں میں موجود ہو مجھے تحریک دیتا ہے اور میں لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔ تکنیک خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا حالیہ ناول ''گردش رنگ چمن'' اس کی مثال ہے۔ میرے ذہن میں ایک منظر تھا میری والدہ تعلیم کے فروغ کی حامی تھیں اور ان خواتین سے جو تعلیم یافتہ ہوں خصوصاً وہ جو باہر سے پڑھ کر آئی ہوں مل کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ ایک زمانے میں کوئی خاتون انسپکٹر آف اسکول بن کر لکھنؤ آئی تھیں۔ میری ماں مجھے ساتھ لے کر ان سے ملنے گئیں، ان کا گھر پر ہجوم درختوں کے اندر چھپا ہوا تھا۔ یہاں دو خواتین اور درمیانی عمروں والی غیر شادی شدہ بہنیں تھیں۔ ان میں سے کم عمر بہن بہت جاذب نظر تھی انسپکٹر تھی اور انگلستان میں رہ چکی اور ظاہر ہے کہ اس دور کے لیے یہ سب کچھ ایک عجوبہ تھا یہ 1940 کی بات ہے۔ گھر کے اندر مینٹل پیس پر مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے برتن رکھے تھے۔ بزرگ خاتون نے بتایا کہ یہ برتن انھوں نے ان دنوں بنائے تھے جب انگلستان میں وہ آرٹس اسکول سے وابستہ تھیں۔ یہ سارا منظر میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی کافی عرصہ بیت گیا اور جب میں نے گردش رنگ چمن پر کام شروع کیا تو اس کی ابتدا لکھنؤ کے ایک گھر کی دو خواتین سے ہوئی مگر یہاں وہ ماں بیٹی کے کردار میں تھیں وہ بھی انگلستان میں رہ چکی تھیں۔ لڑکی ڈاکٹر ہے جس کے بارے میں ماں بتاتی ہے کہ جس زمانے میں وہ تعلیم حاصل کر رہی تھی میں نے یعنی ماں نے یہ تصویریں بنائی تھیں۔ اب آپ دیکھیے کہ کس طرح ادیب کے لیے یہ واقعہ یا اسی قسم کا کوئی واقعہ ابتدا کا محرک بن جاتا ہے۔ تھیم اور تکنیک کے بارے میں بیٹھ کر سوچنے کی کوئی ضرورت مجھے نہیں محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً لکھنا شروع کر دیا اور پلاٹ خود بخود بنتا چلا گیا۔ اس ناول میں چونکہ میں نے کئی حقیقی لوگوں کو شامل کر لیا ہے اس لیے میرے نزدیک یہ نیم دستاویزی ناول ہو گیا ہے۔

سکریتا:

بڑی دلچسپ بات ہے۔ کس طرح ایک مختصر سا امیج یا واقعہ ایک بڑے ناول کے روپ میں ڈھل گیا اس سلسلہ میں ایک بات یہ ہے کہ جب آپ کا ایک عام قاری بھی آپ کی کہانیوں

میں بکھری اشیا کے استعمال کو دیکھتا ہے امیج اور وقت کے ساتھ رونما ہونے والے واقعات کو جو کچھ پیش نظر اور کبھی پس نظر دیکھتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں۔ ذرا سنیمائی انداز اور یہ حقیقت بھی ہے کہ میں مصوری سے بھی کسی حد تک استفادہ کرتی ہوں جس کی وجہ سے میرے یہاں رنگوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔

سکرینا:

یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شعور کی رو جیسی تکنیک سے استفادہ آپ کے یہاں بیانیہ اسلوب سے گھل مل جاتا ہے۔ میرے خیال میں برصغیر کے ادیبوں نے ورجینا وولف کی خالص شعور کی رو کے بجائے اسی طریقے کو منتخب کیا ہے۔ آپ کے یہاں وقت کا ایک سیدھا سادا سا شعور ہے اور پھر وقت کے سمندر میں غوطہ زنی ہے۔ بہرکیف چلیے ہم ایک دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔ میں آپ کی توجہ آپ کے اردو معاصر لکھنے والوں کی طرف مبذول کرانا چاہوں گی۔ آپ کا ان کے متعلق کیا خیال ہے جہاں تک نقادوں اور قارئین کا مسئلہ ہے تو ان کے درمیان تو لین دین کا کوئی سلسلہ مشکل ہی سے ملتا ہے لیکن آپ کے ساتھ ادیبوں کا رویہ کیا ہے کیا ایسے ادیب ہیں جن کے بارے میں آپ کوئی نقطہ نظر رکھتی ہیں یا ایسے اہل قلم ہیں جن سے آپ خاص طور پر قرب محسوس کرتی ہوں یا جن کے اثرات محسوس کرتی ہوں۔ ایسے بھی لکھنے والے ہوں گے جن سے آپ دلچسپی نہ رکھتی ہوں۔ کیا آپ مغرب کے ادیبوں اور اردو کے ادیبوں کے درمیان کوئی خط امتیاز قائم کرتی ہیں۔ بعض ایسے بھی ادیب ہیں جنھوں نے دیدہ و دانستہ اپنے معاصروں کو نہیں پڑھا اور سب سے کٹ کر تنہا اپنا کام کرتے رہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں یہ افسوس ناک صورتحال ہے۔ میں نہ صرف یہ کہ اپنے معاصروں کو دلچسپی سے پڑھتی ہوں بلکہ ان میں سے بعضوں کو اردو میں ترجمہ بھی کرتی رہی ہوں۔ اپنے معاصروں کو جان بوجھ کر نہ پڑھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

سکوینا:

ایسے زمانے بھی تو گزرے ہیں جب لکھنے والوں نے دوسروں پر مکمل انحصار کیا یا یوں کہیے کہ صرف تقلید کی پھر وہ دن بھی آئے کہ دوسرے لکھنے والوں سے مکمل طور پر لاتعلقی برتی گئی۔ میرے خیال میں تو یہ دونوں ہی رجحان مناسب نہیں ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ظاہر ہے کہ اصل میں جب ہم اپنے چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں تو خود اپنے آپ کو مالا مال کرتے ہیں اردو میں چار پانچ نمائندہ اہل قلم ہیں جو میرے معاصر ہیں اور بہت سنجیدگی سے لکھ رہے ہیں میں ان کا مطالعہ ضرور کرتی ہوں۔

سکوینا:

''جدیدیت'' کی تعریف کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ بہت مشکل مسئلہ ہے۔ آج جس کو آپ جدیدیت کہہ رہے ہیں کل وہ کچھ اور ہو جائے گی۔ شیکسپیئر نے بھی تو خود کو چوسر کے مقابلے جدیدیت کا پیرو کہا ہوگا۔ اصل میں یہ اصطلاح اضافی ہے۔ انیسویں صدی میں بادلیر اور اس کے بعد تک کے تمام لوگ جدید تھے۔ پوپ بھی اپنے عہد میں جدید تھے۔

سکوینا:

ابتدائی بیسویں صدی میں مغرب ایک قسم کے کلچرل بحران میں مبتلا تھا کیونکہ ہر طرف شک کی فضا تھی۔ صنعتی انقلاب نے عقیدے کے طلسم کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ حقیقت کے بارے میں سائنس نئے انکشافات کو جنم دے رہی تھی اور بعض قائم بالذات مذہبی اقدار کو چیلنج کا سامنا تھا ان وجوہات کی بنا پر زوال آگیا۔ چنانچہ تقسیم ہو جانے والی انسان سائیکی نے تخلیقی اظہار کے نئے نئے فارمولوں کو قبول کرنے کے لیے ایک بار پھر باہمی اتحاد و اشتراک قائم کر لیا۔ اس مجموعی تبدیلی کو ''جدیدیت'' کا نام دیا گیا۔

قرۃ العین حیدر:

فرانس میں تو انیسویں صدی کے ختم تک روایتی صورتیں لرزہ براندام ہو کر ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ ہمارے یہاں یہ لہر بہت بعد میں پہنچی لیکن میرے خیال میں یہاں کی صورت حال کی تشریح مغرب کے حوالوں سے صحیح نہیں ہوگی۔ اردو میں ٹی ایس ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" کم و بیش 1935 میں ترجمہ ہوئی تھی حالانکہ اس کی تخلیق بہت پہلے ہو چکی تھی۔ بادلیر اردو میں سو سال گذرنے کے بعد پہنچے جبکہ سو سال پہلے ہی وہ فرانس کے جدید فن کار تھے۔ مسئلہ وہی ہے کہ جب ہم جدید کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو خود بخود ہی ہم اس کو ان چیزوں سے منسوب کر دیتے ہیں جو ہم تک مغرب سے پہنچی ہیں۔

سکرینا:

کیا آپ اس خیال سے اتفاق نہیں کریں گی کہ مغرب میں جدیدیت قوت کے ساتھ وارد ہوئی ہے اور اس نے لکھنے والوں پر بہت گہرے اثرات ڈالے نہ صرف مغرب میں بلکہ مشرق میں بھی خصوصاً ہندستان میں جہاں برطانوی سرکار نے انگریزی کو رابطے کی زبان کے طور پر رائج کر کے اس کو عام زبان بنا دیا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

لیکن آپ کو تو علم ہے کہ ہماری مصوری تک میں بھی جو کچھ ہوا اور جیسا کہ امریتا شیر گل کے یہاں جو کہ اوّلین جدید مصور ہیں نظر آتا ہے یہ سب کچھ مغرب سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کب اور کس وقت ہندستان میں جدیدیت کا ذکر کر رہے ہیں۔

سکرینا:

یہی سن 1950 کے عرصے کا۔

قرۃ العین حیدر:

کیا ہے سوائے ذات کے داخل کی عکاسی کے۔

سکرینا:

اس قسم کا احساس بیسویں صدی کے اوائل کے انگریزی ادب میں بھی ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

صحیح ہے۔ یہاں اس کو کافی دیر میں دہرایا گیا۔ بہر حال میں تو اس کا حصہ نہیں ہوں۔ میں نے تو یہ مونولوگ درونِ ذات کا انعکاس' شعور کی رو اور تجریدی خیال آرائی وغیرہ کو ان دنوں پیش کیا تھا، جو میرا کم عمری کا زمانہ تھا۔ یعنی 1940 میں اس طرح دیکھیے تو ان رجحانات کی ابتدا مجھ سے ہوتی ہے۔ تاہم اب تک کسی نقاد نے بھی اس حقیقت کو مان کر نہیں دیا ہے'ستاروں سے آگے' میں میری کہانیاں اسی نئے پن کا عکس پیش کرتی ہیں ان میں ایسے تمام خیالات ملتے ہیں جو اردو میں دوسری نسل کا موضوع بنے۔ میرے لیے تو اب یہ سب کچھ قصہ پارینہ ہے میں بہت پہلے ہی ان مراحل سے گذر چکی ہوں اور یہ سب کچھ میں نے لاشعوری طور پر ہی کیا، فیشن کے طور پر نہیں۔

سکرینا:

وہ ادیب جو ابتدائی کئی دہائیوں سے آپ کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے رہے ہیں اور جن میں چند ایسے بھی ہیں جن کے یہاں ہمارے حوالے کے مطابق جدیدیت کے آثار و مظاہر تیس چالیس سالوں کے بعد ظاہر ہوئے آپ کے خیال میں کیا انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس میں کوئی اضافہ کیا ہے یا پھر یہ ہمارا جدید ادب محض ایک تقلید یا ادھار قسم کی لی ہوئی کوئی چیز ہے۔ کیا آپ یہ تو محسوس نہیں کرتی ہیں کہ فلاں فلاں ادیب آپ پر اثر انداز رہا ہے کیا چالیس اور پچاس کے دوران اردو ادیب کو درون ذات کے اظہار پر مجبور کرنے کا سبب اس کی ادبی تکنیک نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اب تک ہمارے نئے لکھنے والے اپنی انفرادیت قائم نہیں کر سکے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اہم واقعات اور ملک کی آزادی و خودمختاری نے مشکل ہی سے ہمارے لکھنے والوں میں آزادی و اعتمادی کا کوئی مثبت و مضبوط رویہ پیدا کیا ہے۔ البتہ برصغیر کی تقسیم کے واقعہ نے ضرور ہمارے ادیبوں کی حسیت کو گرفت کیا ہے۔ ہندی اور اردو نے میرے نزدیک ستر اور ساٹھ کے

دور میں پختگی پائی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

پختہ افسانے سے آپ کی مراد کیا ہے؟ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تیس کے عرصے میں احمد علی اور منٹو نے شاہ کار افسانے لکھے تھے۔

سکرینا:

میرے خیال میں کم ہی ایسے ادیب ہیں جنھوں نے جدید روح کی قلمرو میں کوئی ایسا لہجہ دیا ہو جو مقامی کہا جائے۔ مثلاً پچاس کے عرصے میں باہر سے آنے والے خیالات کی مصنوعی تحلیل ہوئی۔ فکری قلمرو میں ''وجودی'' اور ''لغو'' وغیرہ جیسے موضوعات پر مکالے ہوتے تھے اور مغربی فلسفہ کی بنیاد پر مختصر کہانیوں کا تانا بانا بنایا جا رہا تھا۔ چنانچہ مختصر کہانی ایک ایسی فلک بوس عمارت بن گئی جو کسی بنیاد کے بغیر توازن قائم رکھے ہوئے تھی۔ اسی زمانے میں بہت زیادہ لکھنے میں تجربے بھی ہوئے۔ 1960 کے اواخر میں جا کر جدید ایک ترقی یافتہ حسیت کی صورت میں منظر عام پر آیا افسانہ نگار مثلاً بیدی۔ رام لال، جوگندر پال، سریندر پرکاش اور بعض دوسروں نے ایسے لہجوں میں لکھا جو منفرد تھے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ آپ کیسے کہہ رہی ہیں کہ رام لعل نے ایک منفرد لہجہ پالیا ہے۔

سکرینا:

یقیناً ان کے یہاں ''ہیئت'' بلاشبہ کسی حد تک روایتی ضرور ہے جس کی وجہ اردو میں بیانیہ تکنیک کا استعمال رہا ہے لیکن فضا بندی جو کہ مختصر کہانی کی اصل حقیقت ہے، ایک نئے پن کا احساس دلاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بیانیہ تکنیک میں رام لعل نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ان کو آپ آسانی کے ساتھ فطری ادیب کہہ سکتی ہیں البتہ جوگندر پال لکھنے میں تجربے بہت زیادہ کر رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہمارے نقادوں کے پاس کوئی بھی ایسی اصل چیز نہیں ہے جس کا وہ اظہار کریں۔ بس وہ اقتباسات دیتے چلے جاتے ہیں اور تقریباً تیس چالیس سالوں سے یہی ہو رہا ہے۔ الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے مگر ان کے اندر کوئی جنوئن تجربہ تلاش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس میں نقطہ نظر بھی محدود اور گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔

سکرینا:

دراصل ہمارے یہاں جدید کہانی اور اکی اور منطقی بنیاد پر ترقی کرتی رہی ہے۔ تنقیدی ذریعے سے ہم اس میں مقامی روایت کا واضح شعور تلاش کر سکتے ہیں۔ ہماری ادبی ہیئت میں مقامی دیو مالا اور مثالی معروضیات (ARCHE TYPE) بتدریج سرایت کرتے رہے ہیں۔ اس میں کتھا اور داستان کے روایتی اسالیب بھی ملے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ نہ جانے کیوں ہمارے بعض نقاد ان مستحکم روایات کو باہر نکال کر جو کہ حقیقت ہیں جدید ہندستانی کہانی پر بات کرتے ہیں۔ مغرب میں بے ترتیبی کے ساتھ جو کچھ بیسویں صدی کے اوائل میں ادب کے اندر ہوا دھیرے دھیرے ہمارے یہاں بھی اس کے اثرات رونما ہوئے اور پھر قدرے مختلف اسالیب اور صورتوں میں ہندی فضا ان کی پرورش کرتی رہی۔

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں ہمارے نقادوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ مطالعہ بالکل نہیں کرتے ہیں بس جو کچھ پڑھتے ہیں وہی ہے جو کہ انھیں برٹش کونسل لائبریری اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مرکز اطلاعات سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے وہ خود کو دہراتے رہتے ہیں۔

سکرینا:

کیا آپ کے خیال میں تنقیدی معیار کے پیمانے غلط ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اصل میں ان بڑے بڑے ناموں نے جن کا ادب کے قارئین پر مکمل کنٹرول ہے

معیاری ادب کی تخلیق کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔

سکرینا:

ایک اور سوال یہ ہے کہ اپنے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔ جب لکھتی ہیں تو خیالوں کی حد میں کھو جاتی ہیں۔ آپ کے ذہن کی حالت کیا ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں ایسا نہیں ہے۔ جادو اور روحانی اقدار پر مجھے یقین نہیں ہے۔

سکرینا:

آپ جو کچھ بھی لکھتی ہیں کیا وہ بجائے خود لکھنے کا ایک سلسلہ ہو کر رہ جاتا ہے یا کسی پہلے سے متعین منصوبے کا نتیجہ ہوتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں میں اس کے لیے باقاعدہ بیٹھ کر پلاٹ کا کوئی منصوبہ نہیں تیار کرتی ہوں بس ایک طرح کا فوری پلاٹ ہوتا ہے جو لکھتے ہوئے خود ہی ترقی کرتا ہے اور بنتا چلا جاتا ہے۔

(طلوع افکار کراچی، مئی 1988)

سر سید بڑے زبردست قسم کے ریفارمسٹ تھے

گفتگو : ڈاکٹر سہیل احمد خاں (پاکستان)

ڈاکٹر سہیل احمد خاں:

اس وقت ہم یہاں قرۃ العین حیدر صاحبہ کی موجودگی میں ان کے ناول 'گردش رنگ چمن' پر بحث کرنے کے لیے موجود ہیں۔ قرۃ العین صاحبہ کا فنی سفر اتنا پھیلا ہوا ہے اور اس میں اتنی وسعت ہے کہ ایک مختصر نشست میں اس پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ مختصر طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بیسویں صدی کے اردو ادب میں اتنا بڑا تخلیقی ذہن علامہ اقبال کے بعد مجھے تو اپنے طور پر قرۃ العین حیدر ہی کا نظر آتا ہے جو تاریخ اور تہذیب میں اتنی دور تک سفر کر رہی ہیں اور ایک تسلسل کے ساتھ افسانوں میں، ناولوں میں انھوں نے اس تہذیب کی گہری سطحوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نئے ناول 'گردش رنگ چمن' پر پاکستان میں کئی طرح کے ردعمل سامنے آئے۔ مختلف تبصرے بھی ہوئے۔ صفدر میر نے، محمد سلیم الرحمٰن اور نثار عزیز بٹ صاحبہ نے اس پر تبصرہ کیا۔ ان سب نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ان کے پرانے ناولوں سے اس نئے ناول کا مزاج کس حد تک ہم آہنگ ہے اور کس حد تک اس میں اور جہتوں کا اضافہ ہوا ہے اور اس سلسلے میں ان

کے زندگی کے بارے میں جو رویے ہیں یعنی 1947 میں یا اس سے ذرا پہلے جب 'ستاروں سے آگے' شایع ہوئی تھی تو ALIENATION کا جو احساس تھا کہ ایک انسان ہے جیسا کہ محمد حسن عسکری کے افسانوں کا مجموعہ جو اس زمانے میں آیا تھا اس کا عنوان 'جزیرے' تھا۔ اس میں انھوں نے یہ کہا کہ انسان زندگی کے سمندر میں الگ تھلگ جزیروں کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ اس زمانے کا طرز احساس تھا جو دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرا تھا اور یورپ کی پوری شکست و ریخت اس کے پس منظر میں موجود تھی اور اس وقت کے ہمارے کچھ دانشور اس طرز احساس سے متاثر تھے۔

اس وقت ہم ان کے ناول 'گردش رنگ چمن' کے حوالے ہی سے گفتگو کریں گے کہ 1857 کے بعد کے حالات کا سفر اور 1982 تک کے حالات و واقعات اس میں موجود ہیں۔ یہ بہت بڑا کینوس ہے۔ کئی نسلیں ہیں اور اسالیب کے لحاظ سے بہت تنوع ہے۔ ایک کتاب کے اندر اتنے اسالیب کو کھپا دینا یا اتنی بڑی بات ہے کہ اس دور کے کسی اور لکھنے والے کے ہاں شاید ہی نظر آئے۔ اس ناول میں بھی میں نے مختلف اسالیب دیکھے ہیں۔ داستان گوئی کا اسلوب، وقائع نگاری کا اسلوب، حقیقت نگاری کا اسلوب اور حقیقت اور فینٹاسی کو گڈمڈ کرنے کا اسلوب، اتنے عناصر ایک ناول میں سما گئے ہیں کہ ان کو گرفت میں لانا بڑا مشکل ہے۔

ذوالفقار احمد تابش:

''گردش رنگ چمن'' اردو کا ایسا ناول ہے جو ایک بار پڑھنے سے گرفت میں نہیں آسکتا۔ اس ناول میں جہتیں بہت زیادہ ہیں مثلاً تاریخی شعور ہے، تاریخی شعور کی بالغ نظری جس طرح قرۃ العین کے ہاں ہمیں نظر آتی ہے شاید پہلے نہیں تھی۔ پھر پوری ایک تہذیب اور مسلم تمدن کی شکست و ریخت اور اسے سمجھنے کی شعوری کوشش۔ مسلمانوں کے ہاں اس سے بڑا ایپک نہیں لکھا گیا۔ یہ مسلمان قوم جو یہاں ہندستان میں بس رہی ہے اور دوسری بہت سی قومیں بس رہی ہیں۔ قرۃ العین نے ان کے المیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے ساتھ کیا واردات ہوئی۔ وہ قوم جو ایک ہزار برس تک یہاں حکمراں رہی وہ ایک لخت کہاں دفن ہو گئی۔ ان مغل زادیوں کا کیا حشر

ہوا۔ طرز زندگی اور اس میں تبدیلی کے عمل کو بھی دکھایا ہے اور پھر یہ کہ یہاں پر تہذیبی عناصر کی ٹوٹ پھوٹ کس طرح ہوئی ہے۔

سہیل احمد خاں:

میرے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ جیسے مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا کو لکھنؤ کی تہذیب کی علامت بنا کر پیش کیا۔ آپ نے جو طوائفوں کے کردار کو لیا ہے۔ ایک خاص قسم کی طوائف کے کردار کو تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہماری 90 سالہ زندگی کے بعد یہ اس انداز کی ایک علامت بن سکتی ہے جس طرح سے امراؤ جان اور لکھنؤ کے لیے تھی؟

قرۃ العین حیدر:

میرا خیال ہے یہ اس قسم کی علامت تو نہیں بن سکتی۔ اس وقت ہمارے ہاں عورت کی جو علامت ہے وہ طوائف نہیں ہے بلکہ ایک باہمت اور باشعور عورت ہے جو اپنے حقوق کے لیے لڑ رہی ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ عورت کو ایکسپلائٹ کرنے کے جو راستے تھے وہ اب بدل گئے ہیں۔ اب استحصال کے لیولس بدل گئے ہیں۔ یعنی اب استحصال بڑے ہی SUBTLE طریقے سے ہوتا ہے۔ ذہنی سطح سے بھی معاشی سطح سے بھی اور سماجی سطح سے بھی۔ اس کا میدان بدل گیا ہے۔ اس وقت عورت اگر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی تو ادب میں یا شاعری میں یا سماجی طور پر مجلسی زندگی میں تو وہ محض کوٹھے پر بیٹھ کر ہی ایسا کر سکتی تھی۔ میں نے اس کی تفصیل سے وضاحت کر دی ہے۔ لیکن اب وہ حالات نہیں ہیں۔ دوسرا مسئلہ جو آپ نے کہا مسلم قوم جو حکمراں رہی تھی اس کے زوال کا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ذہنوں پر جو یہ احساس چھایا ہوا ہے کہ ہم حکمراں رہے تھے اس کو اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں اور دیکھیں کہ اس حکمرانی کے کیا اثرات ہوئے، کیا سماجی، تاریخی مسائل پیدا ہوئے یا اس حکمرانی کے کیا اچھے پہلو تھے یعنی تہذیب کی حد تک مثبت تھے یا زبان کی تشکیل کی حد تک تھے اور سیاسی پہلوؤں کا بھی یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔ مسلمانوں میں حکمرانی کا جو تفاخر تھا کہ ہم RULING MASTERS ہیں ہم کچھ دیر کے لیے اس سے نکل جائیں تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں۔ آپ نے فوراً کہا کہ مسلمان قوم جو

حکمران تھی، مغل زادیوں کے ساتھ کیا ہوا۔ حکمرانی کا سلسلہ تو دونوں طرف ہوتا ہے اور بھی لوگ تھے جو محکوم تھے ان کی عورتوں کے ساتھ کیا ہوا؟ ہم نے یہ دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مغل زادیوں کے ساتھ جو ہوا، ہوا، لیکن مغل زادیوں کے علاوہ اور بھی عورتیں تھیں جو اسی طرح بازاروں میں بیچ دی گئیں۔ اس میں حکمرانی کا یا MASTER RACE کا دخل نہیں ہے۔ ہمیں اس COMPLEX سے نکل جانا چاہیے۔

مسعود اشعر:

لیکن ناول سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہی ہے۔ رہا حکمرانی چھوڑنے کا مسئلہ تو بات یہ ہے کہ 1857 تک ایک خاص قسم کی تہذیب بنتی چلی آ رہی تھی گویا 1857 ایک خاص BREAKING POINT ہے۔ اس کے بعد ایک گنگا جمنی تہذیب تھی...... آپ کے ناول میں اس تہذیب کے ٹوٹنے پھوٹنے کا احساس ہمیں معلوم دیتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ اتنا بڑا موضوع ہے کہ فکشن کے احاطے میں لانا مشکل ہے۔ فکشن رائٹر کرداروں کے ذریعے صرف انھی گوشوں کو ٹچ کرتا ہے جو اس کی سیٹنگ میں ضروری ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اب جو گنگا جمنی تہذیب بن رہی تھی۔ ایک چیز میں ہمیشہ ذہن میں رکھتی ہوں کہ ''تہذیب کبھی کوئی ایک وحدت نہیں ہے۔ اکائی نہیں ہے وہ COMPOSITE ہوتی ہے''۔ تشخص ایک دوسرا مسئلہ ہے لیکن تہذیب ہندستان میں علاؤالدین خلجی بلکہ اس سے بھی پہلے فیروز شاہ تغلق کے دور سے گنگا جمنی بننی شروع ہوگئی تھی اور جو میں دکھانے کی کوشش کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ وہ تمام روایات موجودہ ہندستان میں تسلسل کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے ساتھ دوسرا مسئلہ غدر کا ہے وہ تو سب کے لیے ایک DRAMA EXPERIENCE تھا۔ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر، مسلمانوں نے اس تجربے یا ٹریجڈی کو جس طرح برداشت کیا یا اس کا مقابلہ کیا اس کے بارے میں سب جانتے ہیں لیکن جہاں پر سوال آتا ہے مغل زادیوں کا یا مغلوں کا تو مجھے ہمیشہ یہ خیال آیا کہ ایک ایسی قوم جس نے تہذیب میں اتنا بڑا CONTRIBUTION کیا وہ کہاں چلی گئی کیوں چلی گئی؟ اس کی وجہ ان کا

اپنا رویہ ہے۔ اس کے لیے ہم دوسروں کو BLAME نہیں کر سکتے۔ مثلاً قوم کے زوال کے عناصر کہاں سے شروع ہوئے اور کہاں تک آئے۔ کہا جاتا ہے کہ میں اودھ کی تہذیب کی بڑی حامی ہوں تو اودھ کی تہذیب میں بھی یہ عناصر تھے۔ پورے جاگیردارانہ نظام میں موجود تھے۔ پوری شہنشاہیت میں موجود تھے۔ جب ان کی سیاسی طاقت ختم ہوئی اور وہ محمد شاہ رنگیلا کے دور میں پہنچ گئے تو وہاں سے طوائف کا INSTITUTION شروع ہوتا ہے۔ آپ کی جتنی مشہور حکمراں عورتیں تھیں جنھوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں وہ بنیادی طور پر رقاصائیں تھیں۔ میں نے ان سب کا ذکر کیا ہے۔ چندا بائی، مہ لقا اور بیگم حضرت محل وغیرہ۔ ہماری سوسائٹی میں ایسا ہوا، میرا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہماری مسلم سوسائٹی میں ایسا کیوں ہوا کہ عورت کو کوئی اہمیت اسی وقت دی گئی جب وہ باہر آ کر کوٹھے پر بازار میں آ بیٹھی۔ میں نے ناول میں کیلاش نارائن کے ذریعے کہلوایا ہے کہ ایسا پہلے نہیں تھا۔ اسپین میں تھا تر کوں کے ہاں ایسا نہیں تھا۔ سنٹرل ایشیا میں ایسا نہیں تھا۔ خود ایران میں سلجوقی ترکوں کے، ایسے دور آئے ہیں کہ عورتوں کی بہت اہمیت تھی کیونکہ وہ مارشل تھیں۔ THEY WERE EQUAL PARTENERS IN GOVERNMENT وہ رقاصائیں یا گانے والیاں نہیں تھیں۔ ہمارا جو پورا سلسلہ تھا وہ یہ تھا کہ میں چونکہ اسی معاشرے کی پروردہ ہوں جو یوپی کا انڈو مسلم معاشرہ کہلاتا ہے یعنی جو زمین دار ہوتے تھے ان کے ہاں جو مسٹریس ہوتی تھی وہ چور محل کہلاتی تھی اور وہ اکثر بڑی عمدہ شاعرہ بھی ہوتی تھی ڈانسر بھی ہوتی تھی اور SHE WAS A PERFECT HOSTESS جو گھریلو عورت ہوتی تھی وہ لڑاکا، جاہل اور اس میں دنیا بھر کی بُرائیاں سمجھی جاتی تھیں، اسے تعلیم نہیں دی جاتی تھی، اسے لکھنا پڑھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ اگر تھوڑا سا لکھ پڑھ جائے تو 'حرافہ' کہلاتی اور تعلیم اس کے لیے گالی بن جاتی تھی۔ ہمارے ہاں یہ DECADENCE کیوں آیا؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں جب کوئی چیز لکھنے بیٹھتی ہوں تو میں چاہتی ہوں کہ تاریخی اور عوامی عوامل کو پہلے سمجھ لوں یعنی کوئی چیز ہوا میں معلق نہیں رہے۔ اب یہ اینگلوانڈین کے بارے میں محض ڈانسر نورما کا کردار پیش کر سکتی تھی لیکن میں پیچھے کی طرف گئی کہ یہ اینگلوانڈین کیسے آئے؟

مسعود اشعر:

جب آپ نے یہ ناول لکھنا شروع کیا تو کیا اس کے مرکزی خواتین کرداروں کے بارے میں پہلے سے کوئی اصل کردار بھی آپ کے ذہن میں تھے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اس کا طوائفوں سے کوئی تعلق نہیں۔ میری والدہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں پائنیر تھیں اور ہمارے بچپن میں جو مسلمان لڑکیاں انگلینڈ سے پڑھ کر آتی تھیں یا ایم۔ اے وغیرہ کرتی تھیں (اور بہت کم ہوتی تھیں) تو ہماری اماں ان کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ان کو ENCOURAGE کرتی تھیں۔ لکھنؤ میں ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک اجاڑ سی کوٹھی تھی جس میں ایک زمانے میں مرزا رسوا رہا کرتے تھے۔ اس کوٹھی میں دو خواتین آ کر رہیں۔ جن میں سے ایک انسپکٹر آف اسکول تھیں۔ دونوں غیر شادی شدہ تھیں۔ مڈل ایج خواتین تھیں۔ میں اماں کے ساتھ انھیں ملنے کے لیے گئی۔ ان کے مینٹل پیس پر کچھ مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اماں ان سے باتیں کرنے لگیں۔ بڑی بہن نے کہا کہ جب یہ چھوٹی انگلینڈ پڑھنے کے لیے گئی تھی تو وہ تو پڑھ رہی تھی اور میں نے ایک آرٹ اسکول جوائن کر لیا۔ یہ بات میرے دماغ میں رہ گئی۔ اس بات نے مجھے بڑا FASCINATE کیا۔

مسعود اشعر:

ناول میں ان کا ذکر ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں ناول میں ذکر نہیں ہے۔ میں نے بتایا کہ عنبرین میڈیکل کرنے گئی ہے اور اس کی اماں......

صفدر میر:

اس ناول میں جیسا کہ مثلاً "آگ کا دریا" دو ہزار سالوں پر محیط ہے اور اس کے مختلف حصے ہیں جو بالکل مختلف ہوتے ہوئے بھی INTEGRATED ہیں۔ اس میں واضح طور پر ایک تقسیم

محسوس کرتے ہیں لیکن اس ناول (گردش رنگ چمن) میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ 1857 سے لے کر تا حال کا جو زمانہ ہے جس پر طوائفوں کا یہ گروہ حاوی ہے (کیونکہ سب سے زیادہ طوائفوں کا کردار ہے) اس میں اچانک ایک ایسا ELEMENT آجاتا ہے جس کا تعلق بالکل ایک دوسری دنیا سے ہے وہ ہے میاں صاحب کا کردار۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارے ناول کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ INTEGRATION کسی وجہ سے نہیں ہو پا رہی۔ ممکن ہے میں غلط ہوں لیکن یہ میرا احساس ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ بات مجھے اور بھی بہت سے لوگوں نے کہی ہے۔ لیکن میں عرض کروں کہ جب میں ناول لکھ رہی تھی تو میں نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ اس وقت کی ہندستانی مسلم سوسائٹی ہے۔ اس لیے میں نے اسے نیم دستاویزی ناول کہا ہے، ڈاکومنٹری پروڈیوسر اپنا کیمرہ کہیں بھی لے جاتا ہے اور پھر اسے اس میں شامل کر لیتا ہے۔ میاں صاحب ہماری سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ ہیں۔ یہ خاندانی زندگی ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی میں یہ کیا رول پلے کر رہا ہے وہ بھی بڑا اہم ہے۔ جب آپ اس پورے معاشرے کا احاطہ کرنے یا تصویر کھینچنے کی کوشش کریں گے جو میں نے پیش کیا ہے لکھنؤ، ماڈرن لکھنؤ یوپی اور اودھ تو اس میں یہ خاصا INTEGRATED ہے۔ وہ سارے کریکٹر وہاں جاتے ہیں۔ وہاں سے نکلتے ہیں۔ میں نے اس میں کوئی چیز تصور سے شامل نہیں کی۔ میں نے اس وقت کی ایک بڑی تصویر پیش کی ہے۔ اس سوسائٹی کی جو ہندستان میں ہے۔ آپ لوگ جو پاکستان میں رہتے ہیں آپ کو اس کا زیادہ آئیڈیا اس لیے نہیں ہو سکتا ہے کہ وہاں کیا تبدیلیاں آرہی ہیں، میں نے ان مسائل کا بغور جائزہ لیا ہے وہ انھیں کس طرح حل کر رہے ہیں، کس طرح سامنا کر رہے ہیں یا آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ ہم صرف NEGATIVE SIDE دیکھتے ہیں۔ آپ کے یہاں ہمارے ہندستانی مسلمان کا IMAGE بڑا NEGATIVE ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کیمپس کے بارے میں ساؤتھ انڈین مسلمانوں کے بارے میں یا کیرالہ کے بارے میں یا بنگالی مسلمان کے بارے جس

بڑا اچھا ناول لکھا جا سکتا ہے مگر کوئی نہیں لکھتا۔ جہاں تک کے اس معاشرے کو پیش کرنے کا خیال تھا اس میں اس طرح کے لوگ میاں صاحب کے ہاں آتے ہیں۔ یہ ایک نیا طبقہ ہے جو آزادی کے بعد سے ہندستانی سوسائٹی میں پیدا ہو رہا ہے، ایک نئی مسلم تعلیم یافتہ سوسائٹی اُوپر آ رہی ہے۔

ذوالفقار احمد تابش:

اس ناول کے تین مرکزی کردار تین بڑی طوائفیں ہیں۔ دو بہنیں اور ایک نوابن، جو بات میں نے پہلے کہی تھی۔ اب میں اسے سوال کی شکل میں پیش کرتا ہوں۔ یہ دونوں بہنیں بقول آپ کے مغل زادیاں ہیں اور جو نوابن ہے وہ بھی ایک عجیب خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس کا باپ غدر کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ اب نیوروسس کی بات یہ ہے کہ یہ قصہ جب عنبرین تک پہنچتا ہے WHEN SHE COMES TO KNOW ALL THIS تو اس نیوروسس کا باعث کیا ہے۔ آپ کو بھی معلوم ہے مجھے بھی معلوم ہے۔ اس پر RESOLVE نہیں کیا جاتا اور وہ ہو نہیں پاتا۔ اُدھر یہ دونوں بہنیں ایک جگن بی وہ سُرمہ بیچتی ہے۔ چورن بیچتی ہے اپنے ناکردہ جرم جو کسی تاریخی حادثے کی بنا پر اس پر لاد دیا گیا ہے اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ دوسری بہن جو بہر حال کوٹھا چلا رہی ہے وہ بھی اس GUILT سے پوری طرح نکل نہیں پاتی۔ جو صورتِ حال ان کے ساتھ پیش آتی ہے وہ صورت اگرچہ ان کی اپنی تخلیق نہیں ہے وہ ایک تاریخ کے حصے میں ایک حادثے سے اس کی بنیاد پڑتی ہے اور سب اس کا شکار ہوتے ہیں۔

نثار عزیز بٹ:

وہ چند ایک رویے ہیں جو معاشرے میں عورتوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں اور ان ہی رویوں کو اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔

ذوالفقار احمد تابش:

سوال یہی ہے کہ اس تنزل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

قرۃ العین حیدر:

تنزل سے تو ہم سبھی واقف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ایشیائی مسلمانوں کا تنزل اس لیے

ہوا ہے کہ ہمارے ہاں ریفارمیشن آیا ہی نہیں۔ ورنہ پھر اس طرح RENAISSANCE آتی جس طرح یورپ میں آئی تھی، ہم نے اس کو بائی پاس کیا۔ جس طرح یورپ میں بتدریج ذہنی اور معاشرتی ترقی ہوئی وہ ہمارے ہاں نہیں ہوئی اور چونکہ MODERNISATION نہیں آیا۔ مغلوں نے اپنے آپ کو موڈرنائز نہیں کیا۔ میں نے ان چیزوں کو جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ میں اصل میں تاریخ کے فٹ نوٹس میں چلی جاتی ہوں۔ مثال کے طور پر قمر چہر کا میں نے جو قصہ لکھا ہے، قمر چہر کا خاندان ابھی موجود ہے، سلیمان شکوہ گارڈنز مجھ سے ملنے آئے تھے اور سارے کاغذات میں نے ان سے حاصل کیے اور ایک لڑکا رائٹر ہے سید محمد اشرف۔ اس کو میں نے بھیجا وہ مالوے کا ہے، وہ مالوہ درگاہ کے گدی نشین کا پوتا ہے وہ تمام کاغذات لے کر آیا۔ ان کے نکاح نامے وغیرہ۔ ایک زمانہ یہ تھا کہ یہ جو اینگلو انڈین طبقہ پیدا ہوا تھا وہ مسلمانوں سے شادیاں کرتے تھے۔ نکاح ہوتے تھے۔ ان کی لڑکیاں مسلمان رہتی تھیں اور لڑکے عیسائی۔ کسی ملا نے کسی مولوی نے فتویٰ نہیں دیا کہ یہ نکاح ناجائز ہوتے تھے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا RELIGIOUS ESTABLISHEMENT جو تھا وہ ہمیشہ اس زمانے کے حکمرانوں کا ساتھ دیتا تھا۔ ان کی ترجیحات کا۔ ابھی پچھلے سال میں انگلینڈ میں چارلس بلیئر سے ملی ہوں جو براہ راست شاہ عالم کا پرنواسہ ہے یعنی شاہ عالم کی بیٹی تھی فیض بخش ان کی شادی شاہ عالم نے خود کروائی تھی۔ جنرل پامر (شاید اس وقت مجھے نام یاد نہیں ہے) چارلس کو اس پر بڑا فخر ہے کہ میں شاہ عالم کی اولاد میں سے ہوں۔ کیا وجہ تھی مسلمان بادشاہ، مسلمان نواب اپنی بیٹیوں کی شادیاں اپنی مرضی سے ان لوگوں سے کر رہے تھے۔ پورے سیٹ آپ میں VALUES بدل گئی تھیں۔

نثار عزیز بٹ:

آپ ابھی REFORMATION کی بات کر رہی تھیں REFORMATION اسلام کے دباؤ میں ہوا۔ اسلام میں یورپین نظریات کی طرح کوئی روایت نہیں تھی؟

قرۃ العین حیدر.

میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ جس طرح کا REFORMATION یا جس قسم کی

RENAISSANCE یورپ میں آئی اس طرح کی کوئی چیز ہمارے ہاں ایشیا میں نہیں آئی۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ اس طرح کی چیز یہاں ہونی چاہیے تھی یا ہوتی۔ سوال یہ ہے TOTALLY MEDIEVAL حالات ہمارے ہاں 1857 تک رہے ہیں۔ اس میں آپ کے تصورات وہی تھے۔ وہی کنیزیں، غلام......ان حالات میں عیاشی بھی ہوتی تھی۔ اب سر سیّد میری سمجھ میں بہت آنے لگے ہیں۔ وہ بڑے زبردست قسم کے ریفارمسٹ تھے۔ سر سیّد نے جو کچھ کیا حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بُرے حالات میں انھوں نے یہ کیسے شروع کیا۔ اس وقت عورتوں کی حالت تو بہت ہی خراب تھی۔ اس میں وہ کیا کر سکتی تھیں سوائے اس کے کہ جو وہ کرتی تھیں یا مشنریوں کے چنگل میں پھنس جاتی تھیں۔ اور وہ جو میں نے قمر چہرہ وغیرہ کا بتایا وہ بھی ایک ایسا وقت تھا ہمارے معاشرے کا کہ لوگوں نے ابھی اس کے بارے میں پڑھا ہی نہیں ہے یا توجہ نہیں کی ہے۔

جاوید شاہین:

ناول کا تین چوتھائی حصہ ایسا ہے جس میں واقعات کو عورت کی آنکھوں سے دیکھا گیا ہے اور اس کی زبان سے بیان کیا گیا ہے اور بڑا موثر حصہ ہے پھر اس میں دو ٹکڑے آئے کنور دلشاد علی اور اس کے ساتھی۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ان کی شمولیت ضروری تھی؟

قرۃ العین حیدر:

کنور دلشاد علی ایک خاص کریکٹر ہیں۔ اس قسم کا ایک کریکٹر تھا۔ بالکل اس جیسا نہیں۔ اس قسم کے ایک صاحب تھے۔

مسعود اشعر:

کنور دلشاد علی کے سلسلے میں ایک سوال ہے، آخر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ عنبرین ایک جگہ کہتی ہے کہ ''کنور دلشاد علی کو تو نجات مل گئی لیکن ہم اپنی پرچھائیوں سے کیسے نجات حاصل کریں''۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کنور دلشاد علی میاں صاحب سے ملنے کے بعد اپنے باطن کی SATISFACTION حاصل کر لیتا ہے لیکن وہ جو بڑی بہن مہر و، وہ سات حج کرنے کے بعد بھی SATISFACTION حاصل نہیں کر سکی اور نہ ہی یہ SATISFACTION آخر تک عنبرین کو

حاصل ہوتی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ MYSTICISM جو ہے اس سلسلے میں آپ بھی اپنا بوجھ مردوں کے کھاتے میں ڈال رہی ہیں کہ مرد تو یہاں نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن خواتین کو وہاں بھی SATISFACTION نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ایسی بات میرے ذہن میں نہیں تھی۔ میں نے آخر میں ایک جملہ لکھا ہے کہ ''قطب ستارہ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا''۔ یعنی ہم زندگی میں کوئی فیصلے نہیں کر سکتے۔ NO BODY KNOWS ALL THE ANSWERS میں نے تو ایک کتاب لکھ دی ہے۔ انسانوں کی کہانی لکھ دی ہے۔ جیسی میری سمجھ میں آئی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ کنور دلشاد علی تو بہت دلچسپ کردار ہے۔ بہت سے کریکٹر تو ایسے ہیں جنھیں میں نے شروع ہی سے شامل کر دیا ہے؟

سہیل احمد خاں:

ایک رد یہ یہ ہے کہ ہم ادیب کے بارے میں چند ممنوعہ علاقے بنا لیتے ہیں کہ ادیب کو اس طرف نہیں آنا چاہیے۔ جو ادیب ادھر جانا چاہتا ہے تو ہمیں خطرہ سا ہوتا ہے کہ یہ تصوف کی گود میں چلا گیا۔ یہ تو جاگیردارانہ معاشرے کی طرف جا رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اگر چلا بھی جائے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟

صفدر میر:

آپ کے ناول سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی مڈل کلاس سے آپ کا رویہ ہمدردانہ نہیں ہے۔ دو بہنوں کے کردار اور ان کے بھائی کے کردار وغیرہ، آپ نے ان کو کچھ بہت زیادہ CARICATURE نہیں کر دیا؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں یہ بات سب لوگوں نے کہی ہے کہ نگار خانم CARICATURE ہو گئی ہے۔ یہ MIDDLE CLASS نہیں ہے۔ میرا رویہ MIDDLE CLASS سے ہمدردانہ رہا ہے۔ مجھے

ان سے ہمدردی نہیں ہے اور یہ بات اس (ناول) میں شامل ہے۔

مسعود اشعر:

ابھی سہیل احمد خاں نے بات کی تھی میں اسی حوالے سے بات کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ادیب کیوں فلاں علاقے میں داخل ہوگیا۔ اصل میں پاکستانی پڑھنے والا جب آپ کا ناول پڑھتا ہے تو سارا ہندستانی ماحول سامنے ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول میں یہ DIRECTIVE ہے کہ مسلمانوں کا یہ حشر ہوتا ہے..........؟

قرۃ العین حیدر:

آپ لوگ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ آپ ایک کردار کو SYMBOL OF THE ENTIRE INDIAN MUSLIMS کیوں تصور کر لیتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں آپ کا جو رویہ ہے آپ یہاں بیٹھ کر یہ کہہ رہے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ان کا حشر یہ ہوگا۔ ہمدردی، بے چارے، ہائے بھارتی مسلمان، آپ کا یہ ATTITUDE اچھا نہیں ہے؟

مسعود اشعر:

یہ رویہ سب کا نہیں ہے..........؟

قرۃ العین حیدر:

آپ ایک کردار کو کس طرح پوری سوسائٹی پر حاوی کر رہے ہیں۔ کس طرح سمبولائز کر رہے ہیں۔ اس کی منطق دیں...... میں عرض کردوں کہ ہمارے ہاں کچھ ویو پوائنٹس گئے تھے۔ کچھ ATTITUDES بن گئے تھے۔ پچھلے سوسال میں POST SIR SYED GENERATION کہ ہم لوگ ہر چیز کو مغرب کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور ہمارے اندر جو رشنلزم آئی تھی وہ بھی مغرب کی طرف سے آئی تھی۔ جب انھوں نے کہنا شروع کیا THERE IS A THING CALLED PARA PSYCHOLOGY, THERE IS SOMETHING PARA SCIENCE، تو ہم نے کہا اچھا یہ انگریز کہہ رہا ہے تو یہی ہوگا۔ لہٰذا اپنے ہاں کے یوگی یا صوفی طبقے کے جو تجربات تھے انھیں دو چیزوں کے اثر سے REJECT کیا۔ ایک سرسید نے

دوسرے ان سے پہلے شاہ ولی اللہ نے۔ درگاہوں کے بارے میں الٹ سلٹ لکھا گیا لیکن جب اکیڈمک لیول پر یہ چیز آئی کہ مغرب میں بکسلے نے بات کی۔ ٹی ایس ایلیٹ نے DANCING DERVESH کے بارے میں لکھ دیا تو خیال ہوا کہ یہ بھی کوئی چیز ہے۔ سنجیدہ بات ہے۔ اس کے بعد یوگا اور ویدانت کا ہنگامہ چلا۔ مسلمانوں میں یہ باتیں زیادہ مقبول نہیں ہیں لیکن اکیڈمک سطح پر یہ باتیں کہی اور لکھی جانے لگیں تو ہمارے MASSES نے صوفیا کے بارے میں کہنا شروع کر دیا کہ "یہ انسان دوست تھے"

فاروق عثمان:

ایک شخص نے سوال کیا شاید یہ پاکستان اور ہندستان کی صورت حال کا فرق ہو کہ میں اس کے سوال کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ اس نے کہا کہ "اس ناول کو پڑھ کر میں نے یہ سوچا کہ کیا واقعی کسی خاندان میں اگر کوئی طوائف کا بیک گراؤنڈ ہو تو اب یہ 1982 یا 1983 میں کوئی اتنا بڑا عیب نہیں رہ گیا ہے۔ تمھارے ہاں تو طوائفوں کی لڑکیوں کی بڑے بڑے لوگوں سے شادیاں ہو چکی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ معاملہ بھی اس ناول میں زیر بحث آ گیا ہے کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔

جاوید شاہین:

لیکن عنبرین کے لیے تو یہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

وہ اس لیے کہ وہ ایک INDIVIDUAL ہے۔

انوار احمد:

یہ بات ایسے چلتی ہے کہ ناول عنبرین سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد دو تین ٹریک نکل آتے ہیں کہیں میاں صاحب، کہیں لال بیبیاں درمیان میں آ جاتی ہیں لیکن اس سے قاری کا جو ذہن ہے وہ تو شروع ہی سے عنبرین میں انکار ہتا ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں لکھنے بیٹھی تو لکھتی چلی گئی۔ میں کوئی سوچ کر نہیں لکھ رہی تھی۔ واقعات آتے رہے اور شامل ہوتے رہے۔ پلاٹ ذہن میں آ گیا پھر اس کے بعد سلسلہ چل نکلا۔ آپ لوگوں نے اس میں ایک چیز پر غور نہیں کیا اور وہ ہے FUNDAMENTALISM کا مسئلہ میں نے اسے سنجیدہ طریقے سے اٹھایا ہے کہ عنبرین FUNDAMENTALIST بن جاتی ہے۔ سالمیت کا جو تصور ہے اس پر اسے دھکا لگتا ہے۔ وہ جو پھاٹک کو ٹکر لگاتی ہے کہ یہ پھاٹک یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اسے افسوس ہے کہ لکھنؤ کی وہ تہذیب نہیں رہی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے نکات ہیں کہ جنھیں آپ APPRECIATE نہیں کریں گے کیونکہ ان سے آپ کا تعلق نہیں ہے۔ اس لیے آپ انھیں مس کر جائیں گے کیونکہ یہ سارے مسائل ہندستان کے بدلتے ہوئے منظر نامے کے ہیں۔

ذوالفقار احمد تابش:

آپ کی کہانیوں اور ناولوں میں، میں نے ایک تبدیلی محسوس کی ہے جو آپ سے مخصوص ہے۔ ہمارے ہاں ایک فرقہ جبریہ ہوا کرتا تھا جس کا خیال تھا کہ سب کچھ جو ہو رہا ہے وہ ایسے ہی ہو رہا ہے جیسا کہ تقدیر میں لکھا ہوا ہے، اس کے مطابق ہو رہا ہے۔ پھر آپ کی LATEST STAGE کی کہانیوں اور اس کے ناول میں بھی INCIDENTS اتنے ہوتے ہیں، مثلاً جدو جہد، کچھ اشخاص یا کردار اور طرح کی کر رہے ہیں وہ کچھ اور بننا چاہتے ہیں۔ ان میں جتنے بھی اہم کردار ہیں ان سب کے ساتھ ان سب کی EFFORTS اور ہیں اور DIRECTIONS اور، کروہ کچھ اور رہے ہیں اور ان کے ساتھ ہو کچھ اور رہا ہے۔ آپ کے پہلے ناولوں میں یہ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کچھ وضاحت کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

یہ مسئلہ جبر و اختیار کا ہو جاتا ہے۔

ذوالفقار احمد تابش:

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر اظہار خیال کریں۔

مسعود اشعر:

ذوالفقار احمد تابش کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ہاں INCIDENTS بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

کون سے اتفاقات؟ ایک تو ہوتا ہے CO-INCIDENT اور ایک ہوتا ہے کہ اتفاق جو کہ زندگی کے معاملے میں ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

ذوالفقار احمد تابش:

آپ کے اس ناول میں جتنے بھی کردار ہیں ان کی اپنی اپنی امیدیں اور اندازے ہیں۔ ان کے کچھ رویے ہوتے ہیں اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔ یہ آپ کے پہلے ناولوں میں یا کہانیوں میں نہیں ہوتا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

کیا زندگی میں ایسا نہیں ہوتا؟

ذوالفقار احمد تابش:

ہوتا ہے لیکن میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آپ کے ہاں تبدیلی محسوس کی جارہی ہے کیا آپ کے اندر بھی کوئی تبدیلی ایسی آئی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اس کے لیے آپ میری کتابیں پڑھیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک خاتون جو سولہ سال کی عمر سے افسانے لکھ رہی ہے اس کے بارے میں آپ کیوں سوچتے ہیں کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد بھی وہ اسی طرح لکھے گی......۔

('ماہِ نو' لاہور، جولائی 1988)

پاکستان ایک مقدمہ تھا جو قائداعظم نے جیت لیا

گفتگو : حسن رضوی (پاکستان)

حسن رضوی:

آج ہم اردو کی نامور ناول نگار اور افسانہ نگار محترمہ قرۃ العین حیدر سے گفتگو کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ شریک گفتگو ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، جناب ابصار عبدالعلی اور پروفیسر سجاد حیدر ملک۔ میں عینی آپا سے ایک روایتی سا سوال پوچھنا چاہوں گا۔ آپ کا تعلق علم و ادب کے ایک محترم گھرانے سے ہے۔ آپ نے ناول نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ شعر گوئی کی طرف کیوں توجہ نہیں دی؟

قرۃ العین حیدر:

یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ کو کرکٹ کھیلنے کا خیال کیوں آیا، فٹ بال کیوں نہیں کھیلا؟ رجحان کی بات ہے۔

حسن رضوی:

آپ نے جب لکھنا شروع کیا تو کیا پہلی ہی کہانی سے آپ کی شناخت ہوئی؟

قرۃ العین حیدر:

میں نے لکھنے کا آغاز بچپن میں پھول اخبار سے کیا۔ پھر تہذیب نسواں میں لکھا اور میں یہ سب 25 بار بتا چکی ہوں.....کوئی اور سوال کیجئے۔

حسن رضوی:

لیکن کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ آپ کی پہچان اصل میں جو ہوئی تو وہ ''آگ کا دریا'' سے ہوئی؟

قرۃ العین حیدر:

اچھا تو ہوئی..... ''آگ کا دریا'' کو بھول جائیے۔ میری اور کتابیں بھی ہیں۔ اس ناول پر بہت بات ہو چکی ہے۔ پڑھنے والے تو میری اور بھی تخلیقات کو بھی پڑھتے ہیں۔ مگر ناقدین ایک ہی ناول کی بات کرتے رہتے ہیں۔

حسن رضوی:

صرف ایک چھوٹا سا سوال اس بارے میں 'آگ کا دریا' کو زیادہ تر ناقدین نے تاریخ اور سیاست کے حوالے سے لیا ہے۔ اس سے آپ متفق ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

یہ ناقدین کی اپنی سمجھ بوجھ پر منحصر ہے۔ اس کے لیے میں کیا کرسکتی ہوں، آپ جس حوالے سے چاہیں اسے پڑھیے۔

حسن رضوی:

ویسے آپ کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میں نے ایک ناول لکھا ہے اسے لوگ پڑھیں اور اپنے اپنے طور پر سمجھیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

''آگ کا دریا'' کے حوالے سے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

پھر "آگ کا دریا"۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

یہ تو آپ کا بنیادی کام ہے اس پر گفتگو ہوگی ہی۔ آپ کو خواہ بُرا ہی کیوں نہ لگے۔

قرۃ العین حیدر:

بنیادی کام تو آپ لوگوں نے طے کرلیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرا بنیادی کام نہیں ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

ایک تخلیق وجہ شہرت بھی ہو تو، ہو جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ضروری نہیں کہ مصنف ناقدین کی رائے کو مانے اور ان کی رائے ان کے فرمان کے مطابق چلے۔

ابصار عبدالعلی:

پھر آپ اپنی کس تخلیق کو اپنا بنیادی کام سمجھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

انسان لکھتا رہتا ہے کوئی چیز اچھی لکھتا ہے۔ کوئی بُری لکھتا ہے۔

ابصار عبدالعلی:

آپ کے نزدیک آپ کی کون سی تخلیق اچھی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ بتانا بہت ہی مشکل ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

دیکھیے ہم بات کو کچھ آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد......

قرۃ العین حیدر:

پھر "آگ کا دریا پر آجائیں"۔ بھئی دیکھیے میں نے بہت سے افسانے ایسے لکھے ہیں جن پر بات ہوسکتی ہے، کوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتا ہے کہ کن افسانوں نے کوئی ٹرینڈ شروع کیا۔ کس نئے رجحان کو متاثر کیا۔ بس وہی "آگ کا دریا" کہ اس میں سیاست ہے۔ اس میں سنسکرت ہے۔ اس میں ہندو تہذیب ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ تکرار مصنف سے ناانصافی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عینی آپا کے ناول، ناولٹ یا افسانے اپنی جگہ پر ایک انفرادی حیثیت اس لحاظ سے رکھتے ہیں کہ یہ ان کی اپنی سوچ ہے۔ ان کا اپنا کنسیو کرنے کا طریقہ ہے اور اسے پیش کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ اب "آگ کا دریا" ہی کی بات ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی کوکھ سے بہت سے ناول پیدا ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس کی پیروی کی کوشش کی۔

قرۃ العین حیدر:

میرا اپنا خیال ہے کہ "آگ کا دریا" کے ذریعہ "تاریخیت" کا رجحان پیدا ہوا ہے کہ لوگ تاریخ کو سمجھیں۔ اب اس میں فہم کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سمجھا یہ جارہا ہے کہ تاریخ سیاست کو ڈکٹیٹ کرتی ہے اور سیاست تاریخ کے ردعمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہندستان میں کچھ اور توضیح کی جاتی ہے۔ وہاں مختلف حلقوں کی علاحدہ انٹرپٹیشن ہیں۔ اگر وہاں بی۔ این او کا ایک چھوٹا سا گروپ ہے تو ساتھ ہی پروفیسر عرفان حبیب جیسے مارکسسٹ مورخ بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک گروپ وہاں صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کا بھی تھا۔ کسی چیز کو ہم کلیہ کے طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہاں محض ایک ٹرینڈ اور یہاں یہ۔ پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے پاکستان کا جو نظریہ ہے۔ پاکستانی تشخص کو دریافت کرنے کا جو عمل ہے اس لحاظ سے تاریخیت کا جو تصور ہے میں سمجھتی ہوں کہ اس میں "آگ کا دریا" نے کچھ مدد کی ہے کہ لوگوں نے اس طریقے سے لکھنا شروع کیا۔ پہلے طبقاتی کشمکش کی عکاسی کا رجحان تھا۔

عصمت چغتائی نے 'ٹیڑھی لکیر' سے نفسیاتی ٹرینڈ کا آغاز کیا۔ گھریلو لڑکی کی نفسیات اور ان کے مڈل کلاس کے فرسٹریشن پر لکھا۔ اس سے پہلے عزیز احمد نے ہندستانی پڑھے لکھے مڈل کلاس نوجوانوں کے مغرب سے انکاؤنٹر پر لکھا تھا۔ اس کے بعد عصمت چغتائی اور کرشن چندر کے ہاں ایک قسم کی غذائیت غذائی رومانیت ترقی پسندی آئی۔ اس کے ساتھ انھوں نے بہت سے سماجی مسائل پیش کیے۔ کشمیر کی غربت کا مسئلہ پیش کیا۔ یہ الگ الگ چلتا رہا۔ اس کے بعد جو ناول اردو میں لکھے گئے ہیں۔ آپ مجھے بتلایئے پریم چند کو چھوڑ کر۔ اس دور میں یا آپ اگر بنے بھائی (سجاد ظہیر) کی 'لندن کی ایک رات' سے شروع کرتے ہیں تو بہت سی چیزیں اس دور میں لکھی گئی ہیں۔ پھر اس کے بعد ''آگ کا دریا'' نے جو ایک عجیب سا تہلکہ مچا دیا۔ اس کی وجہ تاریخیت کا تصور ہے۔ تاریخ کیا ہے تاریخ کو ہم کس طرح دیکھیں، اس کے لیے ہم کس طرح سوچیں کس طرح سوچتے ہیں۔ کس طرح سوچیں تو پھر ایک بات ہوگی کہ ایسے سوچو۔ یہ کہ انسان کس طرح انفرادی طور پر تاریخ سے انکاؤنٹر کرتا ہے۔ ہر شخص کے لاشعوری طور پر اپنے کچھ رہنما اصول موجود ہیں۔ خود اس کی اپنی تہذیب بھی اس میں شامل ہے۔ ہندستان میں ملی جلی اجتماعی تہذیب کا مسئلہ تھا۔ دو تہذیبوں، دو لسانی خاندانوں کے ٹکراؤ کا مسئلہ تھا۔ یعنی ترکی، عربی فارسی کا ٹکراؤ بالکل مختلف زبانوں والی ہندستانی تہذیب سے ہے۔ اس کے ساتھ ٹکراؤ ہوا خیالات اور تہذیب کا۔ اس سے جو مسائل پیدا ہوئے ان مسائل کو لوگوں نے مختلف طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس ناول میں اسی ارتقا کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا کوئی تاریخ کا ڈسپلن نہیں تھا۔ میں نے تاریخ صرف بی۔ اے میں پڑھی تھی۔ میں نے اس مضمون میں ایم۔ اے نہیں کیا تھا۔ میں نے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ مجھے شوق تھا۔ اس سے راستہ کھل گیا اور پاکستان میں چونکہ یہاں پر ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان بنا اور اب اس کے بعد اس کی تاریخ، پاکستان تو اس طرح بنا کہ یہ ایک مقدمہ تھا جو جیت لیا گیا۔ سیاست کے میدان میں تین فریق تھے۔ کانگریس، برطانیہ اور مسلم لیگ اسی کیس کو قائد اعظم نے جیتا۔ پاکستان بنا۔ بعد میں یہ مسائل پیش ہوئے کہ کس طرح ہم اس کو ماضی سے مربوط کریں۔ ماضی کیا ہے۔ اس ماضی کے لیے میرا انٹرپٹیشن مختلف ہے، آپ

کا مختلف۔ میں نے اپنا انٹرپٹیشن پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سے یہاں پر یہ رجحان پیدا ہوا کہ تاریخ کی طرف توجہ ہوئی اور میرے خیال میں اس طرح کے ناول بھی لکھے گئے جیسے ڈاکٹر احسن فاروقی کا 'سنگم' جو جواب کے طور پر لکھا گیا۔ حالانکہ جب 'آگ کا دریا' شایع ہوئی تو ڈاکٹر فاروقی نے اس کی بے حد تعریف میں 'ساقی' میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا تراشہ میرے پاس موجود ہے۔

ڈاکٹر اسلم اختر:

مگر بعد میں وہ آپ کے خلاف ہو گئے؟

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں...... اسے ایک سیاسی قصہ بنالیا گیا ہے۔ یہ بے کار سی بات ہے۔ اس طرح میں نے جتنی چیزیں لکھی ہیں۔ ان میں انسان کو میں ایک اکائی کے طور پر نہیں دیکھتی ہوں۔ اس کے پیچھے بہت ساری چیزیں کارفرماں ہیں جن میں اس کی تہذیب ہے جو ایک اجتماعی عمل ہے۔ آپ کہیں بھی جائیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی تہذیب بالکل شدھ (خالص) ہے۔ برطانیہ کی بھی نہیں ہے۔

ابصار عبدالعلی:

شدھ رہ بھی نہیں سکتی۔ راستہ کھلا ہے۔ باہر سے اثرات آتے رہتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں...... یہ اثرات مذہب، زبان اور تجارت کے ذریعہ آتے رہتے ہیں۔ آپ تاریخ کو مارکس کے نظریے سے پڑھیے یا بالکل تجدید پرست ہو جائیے۔ آپ اسلام کے نقطہ نظر سے پڑھیے۔ تاریخ تو اپنی جگہ موجود ہے اس کی تصریح آپ اپنے اپنے طور پر کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

عینی آپا بہت اہم بات کہہ رہی ہیں تاریخ اور تاریخیت میں بہت فرق ہے۔ وہ ہسٹریوگرافی کی بات کر رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں HISTORICITY......یعنی تاریخیت جس کا مطلب ہے تاریخ کا احساس۔

ابصار عبدالعلی:

یہ احساس جمیلہ ہاشمی کے ناولوں میں ملتا ہے۔ جیسے چہرہ بہ چہرہ روبرو اور ''دشت سوس''۔

آغا سہیل:

جی ہاں انھوں نے عینی آپا کو فالو کیا ہے۔ ویسے تاریخیت میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ اس میں کلچر بھی آتا ہے۔ نفسیات اور عمرانیت بھی آتی ہے۔

حسن رضوی:

ابھی حال ہی میں ''کتاب نما'' میں شمیم حنفی کا ایک مضمون شایع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا ہے کہ قرۃ العین حیدر علامہ اقبالؔ کے مانند آتش رفتہ کے سراغ میں ہیں اور ان کی تمام تر سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اب جن کا جو جی چاہے وہ کہے۔ ویسے تاریخ کھوئے ہوؤں کی جستجو نہیں ہے۔

حسن رضوی:

اور وہ جو آپ کی علامہ اقبالؔ سے مماثلت کی بات ہے۔

ابصار عبدالعلی:

کیا آپ اس کی تردید کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

یہ اقبال کے مماثلت کا چکر جانے کس طرح شروع ہوگیا۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟

ابصار عبدالعلی:

پھر بھی۔

قرۃ العین حیدر:

علامہ اقبالؒ ایک بہت عظیم شاعر اور مفکر تھے۔ میں ان سے بے حد متاثر ہوں۔ لیکن وہ تاریخ کو اسلام اور مسلمانوں کے رول کے مطابق دیکھ رہے تھے۔ میں اس نقطہ نظر کے علاوہ تاریخ کے اور بھی جو دھارے تھے انھیں بھی دیکھتی ہوں۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

اقبال اسلامی مابعد الطبیعات کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔

قرۃ العین حیدر:

وہ فلسفی تھے، میں فلسفی نہیں ہوں۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

بات کہیں اور نکل گئی۔ ہم دراصل ''آگ کا دریا'' سے ''گردش رنگ چمن'' تک آنا چاہتے ہیں جو یعنی آپ کا تازہ ناول ہے۔ اس میں بھی تاریخیت موجود ہے۔ اس میں زوال پذیر سوسائٹی کو انھوں نے پینٹ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے محرکات و عوامل کی نشان دہی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو ناول میں یہ بات پہلی مرتبہ آئی ہے۔ اس میں وہ بہت کامیاب رہی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ انھوں نے کئی صدیوں پر محیط تاریخ کو صرف تاریخ کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ تاریخیت کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بہت اہم ناول ہے۔ لہٰذا میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ دنیا کے بڑے ادب میں جو بڑے ناول لکھے گئے ہیں ان بڑے ناولوں کے برابر یہ ایک ناول لکھا گیا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد یہاں لوگوں میں اس پر گفتگو ہوئی۔ بعض لوگوں کو بعض چیزوں سے اختلاف بھی ہوا۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک بھرپور ناول ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے یہاں سے ٹکٹ خریدا، دلی پہنچے اور وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ امام باڑے دیکھے، گومتی دیکھی، ٹنڈے کے کباب کھائے ڈیڑھ دن لکھنؤ میں گزارا اور......

قرۃ العین حیدر:

اور یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے لکھنؤ کا کلچر دیکھ لیا۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

یہ بات درست نہیں۔ عینی آپا نے لکھنؤ کے کلچر کو خود دیکھا ہے۔ ایک ایک بات کا تجزیہ کیا ہے۔ کسی نتیجے پر پہنچی ہیں۔ اس ناول کا موضوع مشکل تھا۔ ہم وہاں سے سراغ لگانا چاہتے ہیں کہ جب بنیاد پرستوں نے ہماری سوسائٹی کو بدلنے کی کوشش کی، ہماری تاریخ میں ایسے زمانے آئے جب جنوبی ہند کے تمام رشتے ٹوٹ گئے۔ اس کے نتیجہ میں شمالی ہند میں جو گڑبڑ ہوئی ہے وہ 1857 کے واقعات کا سبب بنی۔ یہ واقعہ بذاتِ خود کچھ نہیں۔ عینی آپا نے ان واقعات کے پیچھے جو محرکات وعوامل کام کر رہے ہیں انھیں کنسیو کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں انھوں نے ایک صوفی کا کردار پینٹ کیا ہے۔ میرے دوستوں کا خیال ہے کہ وہ ناول سے کوئی الگ چیز ہے۔

قرۃ العین حیدر:

وہ تو اس پورے سیٹ اپ کا ایک حصہ ہے۔ ہندستان کے لوگ ایک ایسی سوسائٹی میں رہ رہے ہیں جس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک پیورلسٹ سوسائٹی ہے جس میں مختلف فرقوں اور طبقات کا انٹریکشن ہے۔ یہ بات صدیوں سے ہے۔ مختلف انٹرلیس اور اسٹرینز ہوتے ہیں۔ پریشر ہوتے ہیں۔ جھگڑے فساد ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ جو خوشگوار سنتھیسس کے مظاہرے ہوتے ہیں وہ سب شامل ہیں اور یگانگت کی چیزیں بھی شامل ہیں۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس میں عروج و زوال سیاسی تغیرات کے لحاظ سے ہوتے رہیں گے۔ اس لیے ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آج یہ چال ہے اور کل یہ ہوگا۔ گویا۔ حالات بدلتے رہیں گے لیکن فریم ورک ایک رہے گا۔ پاکستان میں سوسائٹی پیورلسٹک نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کا ایک ملک ایک قوم ایک زبان اور ایک مذہب ہے۔ ہندستان ایک ملک ہے، کئی زبانیں، کئی مذہب اور کئی کلچر ہیں اور ان کا ٹکراؤ بھی ہے۔ صنعتی دور کی آمد سے جو نئی روایتیں بن رہی ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر اب اچھوت اچھوت نہیں رہا ہے۔ اب شیڈول کاسٹ ملوں کی کینٹین میں برہمن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔

ابصار عبدالعلی:

یہ بتایئے کہ اچھوت جولوں کی کینٹین تک پہنچ گیا ہے اس سے آگے اور اس سے اوپر کب پہنچے گا جو انسانیت کے حوالے سے اس کا حقیقی مقام ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ سیاسی سوال ہے۔ میں اچھوت لیڈر نہیں۔ میں آپ کو کیا بتا سکتی ہوں۔ یہاں کوئی دلت رائٹر آئے تو یہ سوال آپ اس سے کیجئے۔ میں صنعتی دور کی سوسائٹی کی بات کر رہی ہوں جس میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب شامل ہیں۔ آپ جب وہاں (بھارت میں) رہیں گے نہیں تب تک آپ کو کس طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں وہاں اٹھائیس سال سے رہ رہی ہوں۔ میں نے وہاں صحافی کے طور پر کام کیا ہے۔ میں جنوبی ہند اور اتر پردیش وغیرہ کے دیہات میں گئی ہوں۔ وہاں کی زندگی سے واقف ہوں۔ میں کھلے دل سے ہر چیز کو دیکھتی ہوں۔ ہر ایک سے بات کرتی ہوں۔ میرا لوگوں سے رابطہ ہے۔ اس میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ میں ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مین کوئی حکم نہیں لگاتی۔ میں کوئی فیصلے نہیں کرتی۔ میں سیاسی ججمنٹ نہیں دیتی۔ میں نے اس سوسائٹی کی موجودہ صورتحال کے ایک پہلو کو ایک حصہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو بمبئی، لکھنؤ، دلّی اور دوسری جگہوں پر میں نے دیکھا ہے۔ اس میں عورت کا جو رول ہے، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے تو مسلمان عورت کو طوائف دکھایا ہے۔ یہ تو عجیب سی بات لوگ کہتے ہیں۔ بھئی آخر کیا ہمارے معاشرے میں طوائفوں کا طبقہ موجود نہیں ہے۔ یہاں لاہور میں پورا شاہی محلّہ آباد ہے۔ مسلمان عورتوں کا عموماً جس طرح استحصال کیا گیا اور کیا جا رہا ہے فیوڈل تہذیب کے حوالے سے میں نے اسے پیش کر دیا یہ بزرگ کا کردار جو میرے ناول ''گردش رنگ چمن'' میں ہے۔ وہ وہاں کے دیہات اور قصبوں کی خانقاہی تہذیب کے حوالے سے ایک زندہ حقیقت ہے۔ میں نے وہ بھی پیش کیا۔ یہ سب مناظر آپس میں مربوط ہیں۔ میرے بارے میں یہاں یہ بھی کہا گیا کہ میں نے بھگتی تحریک کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھگتی تحریک کی تجدید کی جا رہی ہے۔ میرے بارے میں بالکل بے بنیاد بات ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

ایک قاری کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی اپروچ صحیح ہے۔آپ نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ بنیاد پرستوں نے گڑبڑ مچائی ہے اور سوسائٹی کو بگاڑنے میں انھوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے اور جو آپ نے لکھا ہے وہی اس کا علاج ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی نہیں...... میں نے کوئی نسخے نہیں پیش کیے۔میری بنیادی اپروچ انسان پرستی ہے اس کی ساری دنیا کو آج کل ضرورت ہے۔اس کی وضاحت کو میں ضروری نہیں سمجھتی۔میں نے تو ایک سماجی منظر پیش کیا ہے جس میں میں نے چند انسانوں کی ایک کہانی بیان کی ہے جیسے دلشاد علی خاں ہیں۔ایسے کردار آج کل بھی موجود ہیں۔ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اسے میں نے پیش کر دیا۔اب میرے بارے میں یہ کہنا کہ میں نے نوسٹلجیا کے چکر میں ایسا کیا تو یہ غلط ہے۔نوسٹلجیا کے لفظ کو آپ لوگ بھول جائیے۔ایک انسان ناول لکھ رہا ہے۔وہ کردار تخلیق کر رہا ہے۔اس کا ایک ٹیک آف پوائنٹ ہوتا ہے۔اس سے آگے بڑھ کر مصنف تخلیق کرتا ہے۔اسے نوسٹلجیا کہہ دینا مجھے بڑی عجیب بات لگتی ہے۔آخر نقادوں نے اپنے آپ کو اس جیسے چند الفاظ میں کیوں گرفتار کر لیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

جس ناول کا ذکر ہو رہا ہے وہ میں نے اسی مہینے پڑھا ہے۔آپ نے لکھا ہے کہ 1934-35 میں کوئی فلم بن رہی تھی جس کے مکالمے علامہ اقبال نے لکھے تھے:

قرۃ العین حیدر:

کہانی علامہ اقبال نے لکھی اور مکالمے خواجہ حسن نظامی نے لکھے اور فلم کے مکالمے آزاد نے لکھے تھے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

دوسری ایک بات اور ہے کہ اپنے ناول میں آپ نے ایک خاتون کے پہلے دیوان کا ذکر کیا ہے اور اس کے سرورق کی تصویر بھی دی ہے۔یہ فکشن ہے یا حقیقت ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ملکہ جان کے دیوان کے ٹائٹل کے لیے میں نے شروع میں لکھا بھی ہے کہ بہ شکریہ برٹش لائبریری لندن اور سرورق کی تصویر بھی دی ہے پھر آپ یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ یہ فکشن ہے کیا آپ نے اسے دیکھا نہیں۔ ملکہ جان ایک گلوکارہ تھیں۔ ان کی بیٹی گوہر جان تھیں۔ اسی لیے میں نے اس ناول کو نیم دستاویزی کہا ہے۔ دوسری بات علامہ اقبال کے بارے میں جو ہے بلا تحقیق اپنی طرف سے کیسے کہہ سکتی ہوں کہ انھوں نے فلم کی کہانی لکھی تھی۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

یہاں کسی کو اس بات کا علم نہیں۔

قرۃ العین حیدر:

لاعلمی کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ نیرنگ خیال کے 1934 یا 1935 کے شمارے دیکھیے۔

ان میں آپ کو فلم افغان شہزادہ کا اشتہار پورے صفحہ میں مل جائے گا۔ جس کی کہانی علامہ اقبال نے لکھی تھی۔

حسن رضوی:

''گردش رنگ چمن'' پر بہت سے تبصرے آچکے ہیں۔ ناقدین کا خیال ہے کہ آپ کے اس ناول کا ڈھانچہ آپ کے دوسرے ناولوں کے مقابلے میں بہت مضبوط ہے۔

قرۃ العین حیدر:

......ہوگا۔

سجاد حیدر ملک:

آپ کے اس ناول میں ایک جہت مجھے اور نظر آئی۔ آپ نے نوآبادیاتی دور کی ایک لڑکی کے کردار کا ذکر کیا ہے جو فرانسیسی اور ہندستانی والدین کی اولاد ہے۔ پھر ایک اور انگریز نوجوان ہے جو انگریز اور ہندستانی والدین کی اولاد ہے۔ اس جہت پر کچھ روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ مسئلہ آئیڈنٹٹی کرائسس کا ہے۔ یعنی ہم اصلیت میں کیا ہیں۔ یہ مسئلہ آج کل کافی لوگوں کو پریشان کر رہا ہے۔ فرداً فرداً بھی اور قومی سطح پر بھی۔ اینگلو انڈین طبقے کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلومات ہیں۔ جس گارڈنر خاندان کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ انگریز اور ہندستانی والدین کی اولاد ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ ابھی موجود ہیں۔ گارڈنر خاندان کے بہت سے نکاح نامے فارسی اور اردو میں میرے پاس موجود ہیں۔ جن میں درج ہے کہ مسٹر فلاں فلاں گارڈنر کی شادی بلقیس زمانی بیگم سے ہوئی۔ اس طرح مسلمان لڑکیوں اور عیسائی لڑکوں میں نکاح ہوا کرتا تھا اور دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے تھے۔ اس طرح کے کئی خاندان ہیں۔ اسکنر اور کرک پیٹرک وغیرہ۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب ''اردو کے انڈو یورپین شعرا'' آپ نے دیکھی ہوگی۔ گارڈنر خاندان کے متعدد افراد کا ذکر اس میں ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ابھی زندہ ہیں۔

میں نے کتاب ''گردش رنگ چمن'' میں سلیمان شکوہ کے اینگلو انڈین کے سلسلے کا تذکرہ کیا ہے۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کی لے پالک بیٹی قمر چہر کے سگے پڑپوتے بھی اینگلو انڈین ہیں اور دلّی میں رہتے ہیں۔ ایسے بہت سے خاندان آج بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ انگریز فوجی اور پلانٹر تھے۔ اکثر مسلمان نوابوں کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے تھے۔ بشپ آف کلکتہ ان شادیوں کو درست قرار دیتا تھا۔ یہ دراصل ایک کلاس کا معاملہ تھا۔ ایک صاحب لارڈ رابرٹس تھے۔ ان کے خاندان کی ایک شاخ تھی۔ ان کے ایک بھائی کی اولاد میں ایک صاحب امام باڑہ شاہ نجف کے مرثیہ خواں بھی ہوئے۔ ہر زمانے کے اپنے معیار اور اخلاقیات ہوا کرتی ہے اور اس کو قبول بھی کیا جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی سے لے کر 1920 تک ایک مخلوط انڈو برٹش کلچر رہا ہے جس کا ایک سبب انگریزوں اور مسلمانوں کی آپس کی شادیاں بھی تھیں۔

ابصار عبدالعلی:

ہندستان میں ششی کپور نے ایک فلم بھی ایسے ہی ایک خاندان کے بارے میں بنائی ہے جس میں انگریز مرد کی ہندستانی عورت سے شادی ہوئی ہے۔ اس ضعیف ہندستانی عورت کا کردار

عصمت چغتائی نے ادا کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں اس فلم کا نام "جنون" ہے۔ مسوری میں ایک اینگلو انڈین ادیب رہتے ہیں جن کا نام رسکن بونڈ ہے۔ اس کہانی کی بنیاد غالباً ان کی کسی رشتہ دار کی ڈائری میں لکھے ہوئے واقعات پر رکھی گئی ہے۔

سجاد حیدر ملک:

آپ کے ناول "گردش رنگ چمن" میں عنبرین کا جو کرب ہے وہ کسی بھی اور کردار سے الگ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اس کا کرب اس لیے الگ ہے کہ وہ ایک ایسی قدامت پرست سوسائٹی میں پیدا ہوئی جہاں شادی کا ادارہ قائم ہے۔ اگر وہ آج کے امریکہ یا سوئڈن میں پیدا ہوئی ہوتی جہاں شادی کا ادارہ تقریباً ختم ہو چکا ہے تو اس کے کرب کی یہ صورت حال نہیں ہوتی۔ عنبریں اس کرب کا سامنا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک قدامت پسند معاشرہ میں رہ رہی ہے۔

ابصار عبدالعلی:

مگر فرانس، امریکہ اور سویڈن کی وہ نسل جو شادی کے بغیر پیدا ہوئی ہے ابھی چھوٹی ہے، اسے آگے چل کر اس کرب کا سامنا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

اس ناول پر آپ نے بڑی محنت کی ہے۔ بڑی تحقیق کی ہے۔ یہ بتایئے کہ اسے تحریر کرنے پر آپ کا کتنا وقت صرف ہوا۔

قرۃ العین حیدر:

کوئی چار پانچ مہینے لگے۔ میں رام پور چلی گئی تھی۔ وہاں بیگم صاحبہ رام پور سے بے نظیر کے میلے اور گوہر جان وغیرہ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ بیگم رضا علی خاں آف

رام پور کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

سجاد حیدر ملک:

چونکہ ہر مصنف کا کسی بھی تخلیق کو مکمل کرنے کا اپنا ڈھنگ ہوتا ہے۔ ہمیں اس بارے میں بتایئے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

محسوس ہوتا ہے کہ تحریر کے مقابلے میں تحقیق پر آپ کا وقت زیادہ صرف ہوا۔

قرۃ العین حیدر:

آپ کی مراد یہ ہے کہ میری تحریر سرسری ہے۔

ابصار عبدالعلی:

آپ پاکستان تشریف لائی ہیں یقیناً آپ کو یہاں سے اپنے نئے ناول کے لیے بہت سا مواد ملا ہوگا۔ ہم آپ کے نئے ناول کی کب تک توقع کریں؟

قرۃ العین حیدر:

میں اس کی قائل نہیں کہ کسی ملک میں ایک دو مہینے کے لیے جاؤں اور وہاں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرلاؤں۔ یا اپنے تاثرات کی بنا پر کوئی ناول لکھ ڈالوں۔

ابصار عبدالعلی:

مگر ایک انٹیلکچول تو کرلیتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اگر کرتا ہے تو غلط کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

لوگ تین دن کسی ملک میں رہتے ہیں اور سفرنامہ لکھ ڈالتے ہیں۔

ابصار عبدالعلی:

بلکہ بعض سفرنامے تو پاسپورٹ سے پہلے ہی مکمل ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ بھی غلط ہے۔ چند دن کے مشاہدے پر رپورتاژ تو لکھا جا سکتا ہے جو میں نے بہت لکھے ہیں ناول نہیں لکھا جا سکتا۔

ابصار عبدالعلی:

آپ تقریباً اٹھائیس تیس برس کے بعد پاکستان آئی ہیں۔ ہندستان اور یہاں (پاکستان) کی معاشرت، رہن سہن میں آپ کو کیا فرق محسوس ہوا؟

قرۃ العین حیدر:

یہاں چند طبقات کو جو خوشحالی ملی ہے۔ اس میں وہ بڑے خوش ہیں۔ بڑے مطمئن ہیں۔ رائٹرز بھی ہمارے ہاں جیسے ہیں خوب جھگڑتے ہیں۔ بحثیں کرتے ہیں۔ گو ان کے مسائل دوسرے ہیں اور ہندستان کے ادیبوں کے دوسرے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

پاکستان کے قیام کے بارے میں کوئی رپورتاژ تو لکھا جائے گا یا وہ بھی نہیں؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

یہ بتائیے کہ آپ نے جس زوال پذیر معاشرہ کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اس معاشرے کے زوال کے محرکات وعوامل کیا تھے؟

قرۃ العین حیدر:

اس کی بنیادی وجہ اٹھارھویں صدی میں بادشاہوں کی عیاشی اور جدید تعلیم کی طرف سے بے زاری تھی۔ میں نے اس بات کو ایک فوجی مہم جو کلاڈ مارٹن کے حوالے سے پیش کیا ہے جو ہندستان آتا ہے۔ وہ یورپین بچوں کے لیے ایک زبردست ٹرسٹ چھوڑ کر جاتا ہے۔ جس کے تحت آج بھی ایک کالج چل رہا ہے۔ اس کے زمانے میں مسلمان فوجی سردار صرف عیاشی میں لگے

رہے۔ ایک کالج ایک اسکول نہیں کھولا۔ جدید تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ کلاڈ مارٹن سے آصف الدولہ توپیں ڈھلواتے تھے جو ٹیپو سلطان کے خلاف استعمال کی گئیں۔ خانہ جنگیوں میں استعمال ہوئیں۔ یہ کس قدر کربناک صورت حال تھی۔ جس توپ کا میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ ٹیپو سلطان کے خلاف استعمال ہوئی وہ آج بھی لکھنؤ میں لامارٹینیر کالج کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ عیاشی اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انگریز جب ٹیپو سلطان کو ہرا کر آتے ہیں تو اس خوشی میں انگریزوں کی طرف سے چندا بائی مہ لقا کو منصب عطا ہوتا ہے جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

ابصار عبدالعلی:

اور چندا بائی مہ لقا اسے قبول کر لیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

کیوں نہ کرتی، چندا بائی بھی تو اسی زوال پذیر معاشرہ کی فرد تھی۔ مطلب یہ کہ زوال تو شروع ہو گیا تھا مگر مسلمانوں میں اس کا احساس شروع نہیں ہوا تھا۔

ابصار عبدالعلی:

سرسید کے دور میں آ کر یہ احساس جاگا۔ غالب کے ہاں بھی یہ احساس ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں......شاہ ولی اللہ کے ہاں بھی یہ احساس موجود تھا۔ لیکن ایک اور حوالے سے تھا۔ مگر اس سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ ماڈرن کونشنس تو تھی ہی نہیں۔ میں نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ کچھ انگریزی کتابیں عیسائی مشنریوں نے ترجمہ کروائی تھیں۔ یہ ڈاکٹر جانسن کی کچھ کتابیں اور کچھ دوسرے ناول تھے اور انھیں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریروں کے لیے ماڈل بنایا تھا۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

جیسے توبۃ النصوح۔

قرۃ العین حیدر:

جی نہیں۔ یہ ڈاکٹر جانسن کا ایک ناول تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ یورپین اس قدر مہذب ہیں

کہ کالے لوگوں کو تہذیب آشنا کرنا اوران پر حکومت کرنا ان کا حق ہے۔ یہ ناول اردو میں ترجمہ کرا کے لوگوں کو پڑھائے جاتے تھے۔ اس دور کے مسلمانوں میں کچھ حساس اور ذہین لوگ بھی تھے جیسے بادشاہ نصیر الدین حیدر۔ اس نے لکھنؤ کو واقعی جدید بنانے کی کوشش کی، ہسپتال، پرنٹنگ پریس اور انگریزی اسکول قائم کیے۔ مگر انگریزوں نے اسے بھی عیاشی اور محرم کی رسومات میں لگا دیا اور وہ سب بھول گیا۔ اب آپ جو یہ کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کا زوال دکھایا ہے تو اس زوال کے اسباب بھی بتائے ہیں۔ میں نے محض آنکھ بند کر کے نہیں لکھا۔ یہ مسلمانوں کا نہیں ایک تہذیب کا زوال تھا۔

حسن رضوی:

بھارت میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ ایک سیاسی سوال ہے اور اس سے ادبی گفتگو میں اس کا مفصل جواب دینے کی گنجائش نہیں۔ ہندستان میں اردو کے مستقبل کا انحصار وہاں کے سیاسی حالات پر ہوگا۔ اس برصغیر میں زبانوں کی سیاست ایک پیچیدہ صورت اختیار کر چکی ہے۔ پاکستان اس نوع کی صورت حال کا سامنا مشرقی پاکستان کے زمانے میں کر چکا ہے۔ آج بھی برصغیر کے لسانی مسائل کا تعلق ان ممالک کے سیاسی معاملات سے ہے۔

حسن رضوی:

انتظار حسین کو آپ نے پڑھا ہے۔ ان کی کہانیوں اور ناول میں ایک ہی صورت حال ہے لیکن آپ نے اپنے ناولوں میں مختلف اسالیب سے کام لیا ہے۔ یہ شعوری کوشش کا نتیجہ ہے یا یہ لاشعوری طور پر ہوا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہر شخص کا اپنا اپنا اسٹائل ہوتا ہے۔

حسن رضوی:

پاکستان اور ہندستان دونوں جگہ آپ کے ناولوں کے حوالے سے آپ کے مغرب زدہ

ہونے کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی سارا پاکستان، سارا ہندستان ہی مغرب زدہ ہو گیا ہے۔

سجاد حیدر ملک:

آپ کی کتابوں میں انگریزی کے لفظ بہت آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اردو کی شاعری، تنقید اور افسانے میں انگریزی کے بے حد الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ آپ نے یہ سوال کیا۔ مجھے تعجب ہوا۔ روزمرہ کی بول چال میں آپ خود انگریزی کے کتنے الفاظ بولتے ہیں؟

سجاد حیدر ملک:

میرا مطلب ہے کہ بہت سے انگریزی الفاظ جو آپ استعمال کرتی ہیں اس کے اردو متبادل موجود ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

میرے بارے میں اظہار رائے اور تنقید صرف چند الفاظ یعنی نوسٹلجیا، مغرب زدگی اور انگریزی زبان کا استعمال میں ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ بات مختصر ہے کہ ہمارے ہاں فکشن کی تنقید ہے ہی نہیں۔ ابھی ہمارے ہاں فکشن کو پڑھا ہی نہیں گیا۔ آپ لوگ بس شاعری کو سمجھ لیتے ہیں کیونکہ یہ اردو میں بہت پہلے سے موجود ہے۔

ابصار عبدالعلی:

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب اس کا جواب دیں۔ عینی آپا تنقید نگار پر تنقید کر رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک کر رہی ہوں۔ ہمارے ناقدین نے فکشن کو پڑھا ہی نہیں۔ بس شاعری پر تنقید کرتے ہیں اور اچھی تنقید کرتے ہیں۔ فکشن پر تو تنقید کی ہی نہیں گئی۔

ڈاکٹر آغا سہیل:

اور اگر کی بھی گئی تو تنقید نگار نے اسی حوالے سے خود اپنا قد بڑا کرنے کی کوشش کی۔

ابصار عبدالعلیؒ:

تاریخیت کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی کے ناولوں کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے۔
خاص طور سے ''چہرہ بہ چہرہ'' روبرو پر جو قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں ہے اور ''دشت سوس'' جو منصور کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں کیا تاثر دوں۔ جمیلہ ہاشمی زندہ ہوتیں تو خود بتاتیں۔

ابصار عبدالعلی:

میں ایک بہت بڑی ناول نگار سے اس کے بعد آنے والی ناول نگار کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ دونوں ہم عصر بھی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے۔

حسن رضوی:

دونوں ملکوں کے ادیبوں اور فن کاروں کی آمد ورفت کے حوالے سے پاکستان اور ہندستان کے تعلقات کے بارے میں آپ کا خیال۔

قرۃ العین حیدر:

یہ سیاسی سوال ہے یہ لوڈڈ سوال ہے۔

حسن رضوی:

ہندستان کے علاوہ آپ کی تمام کتابیں پاکستان سے بھی مختلف ناشرین نے شایع کی ہیں۔ سنا ہے ان ناشرین سے آپ کو کچھ شکایات ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی کچھ نہیں۔ بہت سی شکایات ہیں۔ دیکھیے 'آگ کا دریا' کے پہلے ایڈیشن 1960 سے لے کر آج تک مجھے رائلٹی ادا نہیں کی گئی۔ جبکہ پاکستان میں میری رائلٹی کے قانونی حق دار موجود ہیں۔ جن کو رائلٹی ادا کرنے کے لیے میں نے بار بار ناشرین کو لکھا۔ اس ناول کے متعدد اڈیشن پاکستان میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان پر ناشرین کی طرف سے یہ اطلاع بھی موجود ہے کہ "جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں" اور یہ کتاب مصنفہ کی اجازت سے شایع کی جارہی ہے۔ میں نے جو کتابیں لکھی ہیں جو 1960 تک پاکستان اور تادم تحریر انڈیا میں چھپی ہیں، ان کی تحریر ایک درجن سے زائد نہیں۔ علاوہ چند روسی کتابوں کے تراجم کے جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شایع کیے تھے۔ لیکن پاکستان میں میری کتابیں جو مختلف عنوانات سے بلا اجازت چھاپی جارہی ہیں ان کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ یہ کتابیں لاہور، راولپنڈی اور کراچی کے ناشرین نے میرے مختلف افسانوں اور مضامین کے عنوانات کے ردوبدل کے ساتھ شایع کی ہیں اور اس طرح قارئین کو بھی دھوکا دیا ہے۔ میں ضروری سمجھتی ہوں کہ ان تمام جعلی اڈیشنوں کی فہرست یہاں شایع کردی جائے جن کو میری اجازت کے بغیر اور مختلف عنوانات سے چھاپا گیا ہے "کار جہاں دراز ہے" پہلی دو جلدیں اکٹھی کر کے اسے ایک ساتھ چھاپا گیا ہے۔ ایک اور کتاب کا نام "میرے بہترین افسانے" ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ افسانے گویا میں نے خود منتخب کر کے ناشر کو دیے ہیں۔ بیشتر کتابوں پر میری ایک پرانی تصویر بھی چھاپی جاتی ہے۔ حال ہی میں "ہمیں چراغ ہمیں پروانے" کے سرورق پر یہ تصویر کلر میں شایع کی گئی ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ان کتابوں کے اندر "انتساب" میری طرف سے خود تحریر کر کے شامل کیے گئے ہیں اور دوسرے مصنفین کے مضامین بطور دیباچہ موجود ہیں۔ میری کتابوں کے جو مختلف جعلی اڈیشن شایع ہوئے وہ یہ ہیں:

1. میرے بھی صنم خانے، 2. ستاروں سے آگے، 3. سفینۂ غم دل، 4. شیشے کے گھر، 5. آگ کا دریا، 6. آخر شب کے ہم سفر، 7. پکچر گیلری، 8. سیتا ہرن، 9. کار جہاں دراز ہے (جلد اول دوئم)، 10. پت جھڑ کی آواز، 11. روشنی کی رفتار، 12. آدمی کا مقدر، 13. ماں کی کھیتی، 14. کوہ دماوند،

15.گلگشت، 16.ایلس کے گیت، 17.چائے کے باغ، 18.تلاش، 19.جہان دیگر، 20.ہمیں چراغ ہمیں پروانے، 21.ڈنگو، 22.دلربا، 23.جہاں پھول کھلتے ہیں، 24.قرۃ العین حیدر کے منتخب افسانے، 25.میرے بہترین افسانے، 26.فصل گل آئی یا اجل آئی، 27.جگنوؤں کی دنیا، 28.اودھ کی شام، 29.روشنی کی رفتار، 30.تین ناولٹ، 31.خضر سوچتا ہے، 32.ستمبر کا چاند، 33.کلیسا میں قتل، 34.اڑتے خاکے، 35.کچے گھروندے، 36.جہاں پھول کھلتے ہیں، 37.چار ناولٹ۔

ایک ضروری تصحیح:

اپنے انٹرویو جنگ لندن 3، 4 جون 1988 میں، میں نے کہا ہے کہ علامہ اقبال کی کہانی پر مبنی فلم "افغان شہزادہ یا تر کی خون" ایشیا ٹک مودی ٹون لمیٹڈ لاہور کا اشتہار رسالہ نیرنگ خیال میں چھپا تھا۔ پاکستان سے واپس آ کر میں نے اپنے کاغذات میں چیک کیا۔ علامہ اقبال کی لکھی ہوئی کہانی پر مبنی فلم کا اشتہار نیرنگ خیال میں نہیں بلکہ ماہنامہ تصویر لاہور میں جنوری 1935 میں صفحہ 6 پر شائع ہوا تھا اور اس کی پوری عبارت میں نے نقل کر لی تھی۔ یہ رسالہ مجھے صولت لائبریری رام پور یوپی میں 1983 عیسوی میں دستیاب ہوا۔ اس کتب خانے میں اردو رسالوں کا نایاب ذخیرہ موجود ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کہانی اور مکالموں پر مبنی فلم۔ بنگال ٹاکیز کلکتہ نے اناؤنس کی تھی ڈائرکٹر موہن بوس تھے۔

('کتاب نما' دلی، جنوری 1989)

نوٹ: یہ انٹرویو 1988 عیسوی میں لاہور میں قیام کے دوران جنگ کے لیے ریکارڈ کرایا گیا پہلا چینل انٹرویو ہے جسے ہندستان میں کتاب نما نے جنوری 1989 عیسوی میں شائع کیا۔ اس سے قبل یہ جنگ لاہور اور لندن کے ایڈیشنوں میں ۳ اور ۴ جون 1988 عیسوی کو شائع ہوا۔

ہندستان میں اردو سیاست کا شکار ہوگئی

گفتگو : انیس الحق (پاکستان)

(محترمہ قرۃ العین حیدر گذشتہ سال (1988) پاکستان آئی تھیں۔ کراچی میں قیام کے دوران انھوں نے روزنامہ "ڈان" کراچی کے ایڈیٹر کی رہائش گاہ پر ایک انٹرویو دیا جو "ڈان" کی 15 جولائی 1988 عیسوی کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ انٹرویو محترمہ ماجدہ مسرور، جناب ایم ایچ عسکری اور جناب احمد علی خاں نے لیا۔)

ایم ایچ عسکری:

محترمہ! اپنے تازہ ترین ناول "گردش رنگ چمن" کے بارے میں آپ کچھ بتانا پسند کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

جی نہیں۔ میرے ناولوں "آگ کا دریا" اور "گردش رنگ چمن" کو بہت زیادہ ہدف بنایا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ناول نگار کی حیثیت

سے میرا کیا مقام ہے؟ ظاہر ہے کہ ہر وقت یہ تو نہیں سوچتی رہتی کہ میں ادیب ہوں۔

ایم ایچ عسکری:

لیکن لوگوں کے نزدیک آپ کا ناول نگار ہونا ہی آپ کی شناخت ہے۔ بہرکیف ادبی حلقوں کا تاثر ''گردش رنگ چمن'' کے بارے میں یہ ہے کہ ایک نہیں دو ناول ہیں جن کو آپ نے ایک ناول کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناول کا پہلا حصہ آخر کے تقریباً دو صفحات سے بالکل الگ ہے اور اس کا موضوع تصوف ہے۔

قرۃ العین حیدر:

مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پورا ناول اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک مکمل اکائی ہے۔ دوسرا حصہ پہلے حصے سے پوری طرح مربوط اور مسلسل ہے۔ اس مخصوص کردار یعنی پیر صاحب کا تعارف میں نے بالکل ابتدا ہی میں کرا دیا ہے۔ صوفی اور خانقاہ بھی حقیقی ہیں۔ یہ ناول لکھتے ہوئے میرا مقصد اتر پردیش کے مخصوص طبقے کی آج کی معاشرتی زندگی کی جھلک دکھانا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تصوف، جاگیردارانہ دیہی معاشرہ کا ایک لازی جزو بن گیا ہے اور اسے معاشرے کی بُنت سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ صوفی اور پیر مختلف معاشروں کا نکتہ ارتکاز بن گئے ہیں۔ عرس اور خانقاہیں عصری منظرنامے کا حصہ ہیں۔ ہندو معاشرے میں اس کی جھلک مہارشی اور آشرم وغیرہ کے وجود کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ بات میں مذہبی نقطہ نظر سے نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمان دونوں میں زبردست مذہبی بے داری پیدا ہوئی ہے۔

اس بے داری کا معاشرتی پس منظر بھی موجود ہے۔ آبادی میں بے تحاشہ اضافے کی وجہ سے لوگوں کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے اور ان مسائل نے معاشرے میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والوں نے مذہب کے دامن میں پناہ لے لی ہے۔ خانقاہوں اور آشرموں میں بھیڑ بڑھ گئی ہے۔ میں نے اپنے ناول میں ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔

ایم ایچ عسکری:

لیکن ناول میں کافی صفحات آپ نے ان ہی کے لیے وقف کر دیے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! یہ ایسی ہی مسحور کن صورت حال ہے۔ کیا آپ کو محسوس نہیں ہوتا۔ میرے ناقدین کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ جو کچھ میں کہنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہوں وہ اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے انداز بیان کی مخصوص معنویت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے کئی اہم نکات و مفاہیم ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں جو مناظر میں ان کو دکھاتی ہوں، ان کی تہہ داری ان کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔

اس کے علاوہ ابلاغ کا بھی ایک مسئلہ ہے۔ ہندستان اور پاکستان کے درمیان جو فرق ہے وہ مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ یہ فرق زبان کے استعمال اور اظہار کے اسالیب میں بھی موجود ہے۔ میں نے اپنے ناول ''گردش رنگ چمن'' میں اودھ کی سماجی زندگی کے ایک خاص رخ کی عکاسی کی ہے۔ میں نے وہاں کی زندگی کے مخصوص انداز، رسوم و رواج اور اس خطے کی روایات اور مسائل کی عکاسی کی ہے جن سے پاکستان کے لوگ قطعی ناواقف ہیں۔

ایم ایچ عسکری:

میں آپ سے عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ بعض حلقوں کی رائے یہ ہے کہ تصوف آپ پر پوری طرح غالب آ چکا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں جانتی تھی کہ آپ یہی کہیں گے۔ تو سن لیجیے کہ تصوف کی طرف میرا میلان کبھی بھی نہیں رہا۔ میں اپنے گرد و پیش کے حالات اور واقعات کو روحانیت کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے ذہن و دماغ کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں اور یہی ہمیشہ سے میرا نقطہ نظر، یا رویہ رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تصوف نے ہمیشہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا ہے کیونکہ یہ بھی انسانی ذہن و فکر کا ایک حصہ ہے۔ یہ میری تحریروں میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ البتہ ''گردش رنگ چمن'' میں تصوف کو میں نے دانستہ

شامل کیا ہے۔ کیونکہ میں قاری کو جو مخصوص منظر دکھانا چاہتی تھی، تصوف اس کا ایک لازمی حصہ ہے۔

ایم ایچ عسکری:

کیا یہ ایک قسم کی فراریت نہیں ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کیا میرے لیے؟

ایم ایچ عسکری:

نہیں، میری مراد ناول کے کرداروں سے ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں نے اس موضوع کو ناول کے کرداروں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میرے ناول کے اس رخ کی طرف پڑھنے والوں کی اس قدر توجہ کا اصل سبب کیا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میرا یہ ناول جس زمانے میں منظر عام پر آیا تقریباً اسی کے آس پاس قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت ''شہاب نامہ'' شائع ہوئی جس میں انھوں نے اپنے روحانی تجربات بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ دونوں کتابوں کے تقریباً ساتھ ساتھ منظر عام پر آنے سے لوگوں میں یہ تاثر عام ہوا کہ میں بھی روحانیت کی لپیٹ میں آگئی ہوں اور تصوف کے علم برداروں کی صف میں شامل ہوگئی ہوں۔ حسنِ اتفاق کہئے کہ میرے ناول کے صوفی صاحب ایک حقیقی شخصیت ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ میرے ناول نیم دستاویزی ہیں کیونکہ ان کے بعض کردار حقیقی شخصیتوں کا عکس ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بہت سارے کردار فرضی بھی ہوتے ہیں۔ مگر ''گردشِ رنگ چمن'' کے پیر صاحب ایک حقیقی کردار ہیں۔ بلاشبہ روحانیت کے بلند مقام پر فائز ایک مسحور کن شخصیت ہیں۔ بہرکیف کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ یقین کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مادیت سے پرے کچھ نہیں ہے۔

عسکری:

اب ذرا ''گردشِ رنگ چمن'' کے چند دیگر پہلوؤں پر کچھ باتیں ہو جائیں۔ دہلی میں

آپ نے مجھے بتایا تھا کہ اس ناول کے سلسلے میں آپ نے تحقیق بھی کافی کی ہے۔ مستند مواد کی تلاش میں قدیم قلمی نسخوں اور دوسرے مآخذات بھی کھنگالے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ رام پور، کلکتہ اور لکھنؤ بھی گئیں۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ قدیم اودھ کلچر میں عورتوں اور خاص طور پر نام نہاد غیر ملکی عورتوں کا مقام کیا تھا۔ اب کسی صاحب نے لاہور سے ایک مقالہ شائع کیا ہے جس میں انھوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ ناول ان دو عورتوں کے بارے میں ہے جن سے میں اب سے بہت پہلے کالج کے زمانے میں ملی تھی۔ حالانکہ میں نے یہ نہیں کہا۔ میں نے جو کہنا چاہا تھا وہ صرف اس قدر تھا کہ مجھے اپنے ناول کے لیے ایک نقطۂ آغاز کی ضرورت تھی۔ دو عورتوں کا واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے بچپن میں جن دو خواتین سے ملی تھی ان میں سے ایک آرٹسٹ تھیں اور ظروف سازی کرتی تھیں۔ دوسری انسپکٹریس آف اسکولز تھیں۔ اور یہ دونوں آپس میں بہنیں تھیں۔ میرے ناول میں ایک بہن تو بیٹی بن گئی ہے جو میڈیکل کی تعلیم کے لیے اسکاٹ لینڈ پہنچی اور دوسری بہن جو آرٹسٹ تھی اور ماں کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ وطن سے وابستگی جسے آپ NOSTALGIA کہتے ہیں۔ میرے ناول کا جزو ہے اور اس کے بارے میں ناقدین نے بہت کچھ کہا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ناول لکھنے کے لیے یاد وطن سے دیوانہ وار وابستگی کے علاوہ بھی بہت کچھ ضروری ہوتا ہے۔ ناقدین کے پاس میرے لیے چند فرسودہ اور پامال فقروں کو بار بار دہراتے رہنے کے سوا کچھ نہیں۔ میری اپنی رائے تو یہ ہے کہ میری تحریروں میں بہت زیادہ تنوع ہے۔ میں ایک ہی لکیر کو پیٹتی نہیں رہتی، نہ خود ستائی مجھے پسند ہے۔ تاہم میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرے اسلوب میں تازگی اور انفرادیت ہے۔

عسکری:

آج کل آپ جو کچھ لکھ رہی ہیں اس کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

آج کل تو لاہور کے ان چلی شرّوں کے رویے سے سخت پریشان ہوں، جنھوں نے میری

اجازت کے بغیر کتابوں کے ایڈیشن شایع کیے ہیں۔آپ تو جانتے ہیں کہ 1949 سے 1959 تک لاہور کے ایک پبلی شر میری کتابیں شایع کرتے رہے۔وقتاً فوقتاً انھوں نے مجھے رائلٹی بھی ادا کی۔ان دنوں کتابوں کی اشاعت سے جو رائلٹی بنتی تھی وہ کوئی بڑی رقم نہیں ہوتی تھی۔پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔اب صورت حال مختلف ہے۔میری کتابوں کی مانگ بھی اب زیادہ ہے۔لوگوں میں ادب کے مطالعے کا ذوق وشعور بھی کافی بڑھ گیا ہے۔میرے پبلی شر نے 1959 میں جب ''آگ کا دریا'' شایع کیا تو یہ ناول فوراً ہی متنازعہ بن گیا۔کیونکہ اس کے بارے میں کسی اخبار میں ایک مضمون شایع ہو گیا تھا۔اس مضمون کا میرے ناول سے کوئی خاص تعلق نہ تھا بلکہ اسباب کچھ اور ہی تھے۔بہرکیف ناول جب موضوع بحث بنا تو اگلے ہی سال انھوں نے دوسرا ایڈیشن شایع کر دیا۔پھر میں پاکستان سے چلی گئی۔لیکن ''آگ کا دریا'' کی مانگ بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن شایع ہوئے۔ڈی لکس ایڈیشن، پیپر بیک ایدیشن اور دیگر قسم قسم کے ایڈیشن شایع ہوئے۔پاکستان اور بھارت کے درمیان میری معلومات کی حد تک کاپی رائٹ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔لہٰذا دونوں ملکوں میں پبلی شروں کو کھلی آزادی حاصل ہے۔یہاں کے مصنفین کی کتابیں وہاں اور وہاں کے مصنفین کی کتابیں یہاں کھلے عام شایع ہو رہی ہیں۔یہی صورت حال بنگلہ دیش اور مغربی بنگال کے مابین ہے۔طباعت کی جدید ترین سہولتوں کی وجہ سے جعلی ایڈیشن راتوں رات شایع ہو جاتے ہیں۔میرے ساتھ ستم یہ ہوا کہ پبلی شروں نے میری کتابوں کے ٹکڑے کر دیے ہیں اور ان کی تعداد اصل تصانیف سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔طریق واردات کچھ اس طرح ہے کہ چند افسانے ایک مجموعے سے لیے اور چند دوسرے مجموعے سے۔ پھر ان کو ایک نئے مجموعے کے طور پر شایع کر دیا اور ان کا عنوان کسی افسانے سے لے لیا۔مجموعوں کے عنوانات تک بدل دیے گئے ہیں۔میری طرف سے جھوٹے انتساب تحریر کیے گئے ہیں۔ پبلشروں کے نزدیک یہ کوئی قابل اعتراض یا غیر اخلاقی حرکت نہیں ہے۔میں نے اب تک کوئی ایک درجن کتابیں تصنیف کی ہیں۔لیکن پاکستان میں میری تصانیف کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی ہے۔بلاشبہ یہ میری ہی تحریریں ہیں لیکن یہ میری بارہ کتابوں سے الگ الگ ٹکڑے جوڑ کر بنائی گئی

ہیں۔ یہ بھی ہوا ہے کہ میرے ناول "آگ کا دریا" کے ایک باب کو کتاب سے الگ کر کے ایک علاحدہ ناول کے طور پر شایع کر دیا گیا ہے اور اس کا عنوان رکھا گیا ہے "فصل گل آئی یا اجل آئی" برسوں سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔ اور میرے خیال میں اس کے تدارک کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ پچھلے دنوں جب میں لاہور گئی اور بعض پبلشروں سے رابطہ کیا تو انھوں نے اس بات سے ہی انکار کر دیا کہ انھوں نے ان کتابوں کے علاوہ جن کی میں نے اجازت دی تھی، کوئی اور چیز شایع کی ہے۔ ایک صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ میں جب پاکستان آؤں تو ان سے رائلٹی وصول کرلوں۔ پاکستان آ کر جب میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تو وہ اس بات سے صاف انکار کر گئے کہ انھوں نے مجھے لکھا تھا۔ میں نے غرض کیا کہ میرے پاس ان کا خط موجود ہے مگر وہ انکار ہی کرتے رہے۔ میں نے جب اس بددیانتی کے خلاف اعلیٰ حکام سے رجوع کیا تو انھوں نے تحقیقات شروع کیں اور اس معاملے میں کافی سنجیدہ نظر آئے۔ پھر اچانک مجھے معلوم ہوا کہ معاملہ التوا میں ڈال دیا گیا ہے۔

عسکری:

(ہاجرہ مسرور سے) کیا آپ کو بھی اپنی کتابوں کے سلسلے میں ایسے ہی مسائل کا سامنا ہے؟

ہاجرہ مسرور:

جی ہاں۔ ہوتا یہ ہے کہ پبلشر کو اجازت صرف ایک ایڈیشن شایع کرنے کی دی جاتی ہے لیکن وہ ایڈیشن پر ایڈیشن نکالتے چلے جاتے ہیں۔ میری بعض کتابیں جو عرصہ ہوا شایع ہوئی تھیں۔ آج بھی بک اسٹالوں پر دستیاب ہیں۔

عسکری:

اور آپ کو کوئی حساب بھی نہیں دیتے؟

ہاجرہ مسرور:

یہ محض تضیع اوقات ہے۔ رائٹرز گلڈ نے یہ فیصلہ منظور کرایا تھا کہ کاپی رائٹ دس سال بعد خود بہ خود مصنف کو واپس ہو جائے گا لیکن عملاً ایسا نہیں ہوتا اور پبلشرز پینتیس چالیس سال بعد بھی

کتاب شایع کرتے رہے ہیں۔ یہی سلوک میری اور دوسرے پاکستانی ادیبوں کی کتابوں کے ساتھ ہندستانی پبلی شرز بھی کر رہے ہیں۔ مثلاً میں نے یہ سنا ہے کہ خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ہندستان کی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے اور وہاں آزادانہ طور پر شایع ہو رہی ہے۔ اس کے لیے کوئی اجازت حاصل نہیں کی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوٹ مچی ہوئی ہے۔

ہاجرہ مسرور:

صرف یہی نہیں بلکہ پاکستانی کتابوں کے ترجمے ہندی اور دوسری ہندستانی زبانوں میں کسی روک ٹوک کے بغیر شایع ہو رہے ہیں۔

عسکری:

عینی! کیا دیوناگری میں بھی آپ کی کتابیں شایع ہوئی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! بعض کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ ہندی ہندستان کی قومی زبان ہے اور وہاں اس کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ میرا ناول ''آخرِ شب کے ہم سفر'' بھارت کے سب سے بڑے ادبی ادارے ''بھارتیہ گیان پیٹھ'' نے شایع کیا تھا۔ ''آگ کا دریا'' بھارت کی چودہ زبانوں میں شایع ہوا ہے لیکن انھوں نے مجھے رائلٹی ادا کی ہے۔ ہاجرہ! تم تو جانتی ہو کہ ہندستان کے اردو کے بہت سارے ادیبوں نے پاکستانی پبلی شروں کے ساتھ کچھ انتظامات کر رکھے ہیں اور ان کو رائلٹی ادا ہو جاتی ہے۔ یہی صورتحال بھارت میں شایع ہونے والے پاکستانی ادیبوں کے ساتھ بھی ہے۔ البتہ مجموعی حیثیت سے یہ صورتحال افسوسناک ہے۔ میرا مسئلہ جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ میری کتابوں کی رائلٹی کئی لاکھ روپے بنتی ہے اسی وجہ سے پبلی شر صاحبان ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ جمیل الدین عالی کا کہنا ہے کہ پاکستان میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے مگر بہت پیچیدہ معاملہ ہے۔ 1979 میں ہنری کسنجر کی ایک کتاب کسی پاکستانی پبلی

شر نے بلا اجازت شایع کر دی تھی جس کے بعد حکومت نے ایک آرڈیننس جاری کیا کہ کسی غیر ملکی مصنف کی کوئی کتاب حکومت پاکستان کی اجازت کے بغیر شایع نہیں ہو سکتی۔ میرے معاملے میں بھی تحقیقات کا آغاز اسی آرڈیننس کی رو سے ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے کوئی سمجھوتہ ہونا چاہیے۔ آخر ادیب بھی برصغیر کے معاشرے کا ایک اہم جزو ہیں اور ان کو اس طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں اپنا ایک واقعہ آپ کو سناتی ہوں۔ دو تین سال قبل میں ادیبوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی گئی تھی۔ میں نے وہاں کے ادیبوں کو بتایا کہ ہندوستان میں میرا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی کتابیں سب سے زیادہ بکتی ہیں اور میری ایک کتاب وہاں پچھلے تیس سال سے سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں کی فہرست میں شامل ہے لیکن مجھے اپنی محنت کے صلے میں ایک پیسہ بھی نہ ملا۔ میں نے ان کو بتایا کہ اس لحاظ سے میرا اشار گینیز بک آف ریکارڈ میں ہونا چاہیے۔ کانفرنس کے شرکا کے لیے میرا یہ انکشاف بڑا حیران کن تھا کہ دنیا میں ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ادیبوں کو اس قسم کے ظالمانہ سلوک سے بچانے کے لیے دونوں ملکوں کی حکومتوں کو مشترکہ طور پر کچھ کرنا چاہیے۔

ھاجرہ مسرور:

رائٹرگلڈز جب قائم ہوئی تھی تو ہمارا خیال تھا کہ ادیبوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا لیکن ہماری بدقسمتی کہ ایسا نہیں ہوا۔ گلڈ کا سارا زور سیمناروں اور کانفرنسوں کے انعقاد پر صرف ہوا جن میں بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو مدعو کیا جاتا ہے اور انھیں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ اس طرح معاشرے میں اہل قلم کا وقار بلند ہوا لیکن یہ سب کچھ زیادہ تر کانفرنسوں کی حد تک ہوا جن کے ذریعے ادیبوں کو اہم ترین شخصیتوں اور اعلیٰ حکام سے متعارف کرایا گیا لیکن جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ ادیبوں کا تعلق معاشرے کے باعزت طبقے سے ہے اور اس حیثیت سے ان کے کچھ حقوق بھی ہیں جن کا تحفظ ہونا چاہیے تھا۔ ہمارا واحد سرمایہ تو ہماری کتابیں ہی ہیں ان کے سوا ہمارے پاس اور کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بات یہ ہے کہ ادیبوں کے بارے میں بعض لوگوں کا بڑا عجیب رویہ ہے۔ وہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ادیبوں کو روپے پیسے جیسی حقیر شے سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔

اور اب پھر میں اپنے مسئلے کی طرف آتی ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ اصل بات کیا ہے۔ میں تو صرف اس قدر جانتی ہوں کہ پتہ نہیں کیوں کارروائی میں ایک قسم کا جمود طاری ہو گیا ہے۔

عسکری:

جب سے آپ ہندستان گئی ہیں اس وقت سے لے کر اب تک آپ نے وہاں بہت کچھ کیا ہو گا۔ اس کے بارے میں آپ ہمیں کچھ بتائیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

میرا خیال تو یہ ہے کہ جو وقت میں نے بمبئی میں گزارا وہی میرے لیے سب سے حوصلہ افزا اور مفید رہا۔ پہلے تو میں وہاں "IMPRINT" کی مینجنگ ایڈیٹر رہی اور اس کے بعد ایڈیٹر۔ یہ کتابوں کے موضوع پر ایک رسالہ ہے۔ پھر میں ''بینٹ کولمین'' گروپ میں شامل ہوئی۔ یہ ادارہ ''ٹائمز آف انڈیا''، ''السٹریٹڈ ویکلی'' میں تھی۔ ان دنوں سبراتو بنرجی اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس وقت وہاں نامور لوگ کام کر رہے تھے۔ اس کے بعد تقریباً ایک سال میں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ ایک مختصر عرصے کے لیے جامعہ ملیہ دہلی سے بھی وابستہ رہی۔ لیکن علی گڑھ کے ساتھ میری وابستگی بہت پرانی ہے۔ میرے والد محترم سجاد حیدر یلدرم کا تعلق علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبا کی اولین نسلوں سے تھا وہ شعبہ اردو کے بانی بھی تھے۔

اب میں آپ کو ایک بڑی دلچسپ بات بتانا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ چھ سات سال قبل جب میں علی گڑھ میں تھی تو وہاں کے ساتھ آٹھ شعبوں کی سربراہ خواتین تھیں۔ اردو، معاشیات، ایجوکیشن، میڈیکل کالج کے تین شعبے ان میں شامل تھے۔ آپ کو پتہ ہے کہ علی گڑھ، ہندستان کی تین چار سب سے بڑی یونیورسٹیوں میں شامل ہے اور یہ کہ مرکزی حکومت کے ماتحت ہے۔ اس وقت وہاں کوئی بیس ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ سب سے بڑا شعبہ غالباً اردو کا ہے اور فیکلٹی کے سات

آٹھ پروفیسروں کا تعلق اسی شعبے سے ہے۔

ھاجرہ مسرور:

ناول نگار کی حیثیت سے آپ بالائی طبقے کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔آپ بلندی سے اتر کر پستی کے مکینوں کے بارے میں کچھ کیوں نہیں لکھتیں۔

عسکری:

عام تاثر یہ ہے کہ آپ کی توجہ بیش تر ناول کی طرف ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ تاثر درست نہیں۔میں نے افسانے بھی کافی لکھے ہیں۔

ھاجرہ مسرور:

کیا آپ افسانے کے محدود دائرے میں رہ کر مطمئن ہو جاتی ہیں۔میں تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ افسانے میں، میں وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی جو کہنا چاہتی ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

میں کچھ اس طرح کرتی ہوں کہ اگر افسانے میں وسعت کی گنجائش ہوتی ہے تو میں اسے ناولٹ بنا لیتی ہوں۔اگر اس میں مزید پھیلاؤ کی گنجائش ہوئی تو پھر میں ناول لکھتی ہوں۔میں وہی کچھ لکھتی ہوں جو میں لکھنا چاہتی ہوں۔

ھاجرہ مسرور:

فنون لطیفہ سے بھی آپ کو دلچسپی ہے۔پینٹنگ بھی کرتی ہیں۔اسکچز بھی بناتی ہیں۔آپ اس بارے میں کچھ کہنا پسند کریں گی۔

قرۃ العین حیدر:

''گردش رنگ چمن'' کے لیے اسکچز میں نے خود بنائے ہیں۔لیکن یہاں پاکستانی ایڈیشن میں ان کی طباعت بہت خراب ہوئی ہے۔

اور اب کچھ باتیں میری دوسری سرگرمیوں کے بارے میں۔میں ایک ایسے فاؤنڈیشن -

کے لیے کام کر رہی ہوں جو ادیبوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ پاکستان میں لوگ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنے کے علاوہ میں کوئی اور کام نہیں کرتی کیونکہ میری مطبوعہ تصانیف کے ٹکڑے کر کے چالیس کتابیں بنالی گئی ہیں۔ بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ میں فاؤنڈیشن کے لیے بہت کام کرتی ہوں۔ یہ فاؤنڈیشن بی سی سی آئی نے قائم کی ہے اور بی سی سی آئی کے ابن حسن برنی مرحوم نے ہندستان میں فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کی نگرانی کے فرائض مجھے سونپے تھے۔ فاؤنڈیشن کی امداد کا دائرہ صرف اردو کے ادیبوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ادیبوں، صحافیوں، آرٹسٹوں اور ماہرین تعلیم سب کے لیے کام کرتی ہے اور ان کو مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ سردست اس کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع نہیں ہے تاہم ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہاجرہ مسرور:

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ جب آپ لکھنے یا فاؤنڈیشن کے کاموں میں مصروف نہ ہوں تو اپنا وقت کس طرح گذارتی ہیں۔ میرا مطلب آپ کی نجی زندگی سے ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بہت کچھ کرتی ہوں میں۔ مجھے موسیقی کا بے حد شوق ہے۔ پھر میں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کرتی ہوں۔ میں بہت مجلس پسند ہوں۔

عسکری:

میں آپ سے ایک اور بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب میں دہلی گیا تھا تو میرا تاثر یہ تھا کہ آپ مسلمہ ادبی یا ثقافتی اداروں کے ساتھ زیادہ ربط ضبط نہیں رکھتیں بلکہ ان سے گریز کرتی ہیں۔ کیا میرا یہ اثر غلط ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں، آپ کا خیال شاید درست ہے۔ دتی میں، بلکہ لندن میں بھی بہت سے گروپ اور ادارے موجود ہیں۔ میرا ایک شوق تو موسیقی سے والہانہ لگاؤ ہے۔ میں ستار اور پیانو بجاتی ہوں۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس میں میری والدہ مرحومہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے بھی ستار اور ہارمونیم بجانا

سیکھا تھا اور اپنی ہم عصر خواتین کو ماڈرن بنانے کے لیے بڑے جتن کیے تھے۔اس کے علاوہ جب بھی مجھے وقت ملتا ہے میں ٹیلی ویژن دیکھتی ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان وہ سب کچھ نہیں کرسکتا جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ ہندستان کے ٹیلی ویژن پروگرام بہت اچھے ہوتے ہیں، ان کی بعض سیریلز بڑی شاندار ہیں۔ وہ لوگ معروف مختصر افسانوں پر مبنی ڈرامے اور فیچرز بھی تیار کرتے ہیں۔ سلمٰی صدیقی نے میرے ایک افسانے ''حسب نسب'' پر مبنی نوے منٹ کی فلم بنائی ہے۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ ٹیلی کاسٹ کب ہوگی؟ پروگراموں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔

عسکری:

یہاں عام تاثر یہ ہے کہ آپ نے اپنے موجودہ دورے میں تقریبات میں شرکت کے دعوت نامے قبول کرنے سے گریز کیا اس کی کوئی خاص وجہ؟

قرۃ العین حیدر:

صرف یہ کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ میرے اعزاز میں کوئی تقریب ہو جس میں مجھے اسٹیج پر بٹھا دیا جائے۔ میری تصویریں لی جائیں جو اخبارات و جرائد سے شایع ہوں۔ پتہ نہیں کیوں ایسی باتوں سے مجھے جھینپ آتی ہے۔ گریز کی دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ عام طور پر مجھے غلط سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں۔

ھاجرہ مسرور:

نوجوان نسل میں آپ کے خیال میں اچھے ادیب کون کون سے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

ذہین اور باصلاحیت نوجوان تو بہت ہیں لیکن وہ سب ادب اور ثقافت کے ٹھیکہ داروں کے نرغے میں ہیں اور وہ انھیں برباد کر رہے ہیں۔ ہم نے جب لکھنا شروع کیا تھا تو ہمیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ شہرت مل رہی ہے یا نہیں۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ جیسے ہی کسی کا کوئی افسانہ یا کوئی کتاب شایع ہوتی ہے تو پانچ چھ حضرات اس کے بارے میں بڑے گہرے مضامین لکھتے

ہیں۔ یہ لوگ ایک گروہ بنا لیتے ہیں اور کسی کو اٹھانے اور کسی کو گرانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ھاجرہ مسرور:

ذاتی طور پر میں اپنے بارے میں بہت زیادہ لکھنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ آپ جب اپنے بارے میں لکھتی ہیں تو ناخوشگوار باتوں کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میرا اشارہ اس زمانے کی طرف ہے جب ہم سب ساتھ تھے اور ہمیں ایک ساتھ بعض حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے یہی دیکھا کہ آپ ناخوشگوار باتوں یا واقعات کا ذکر نہیں کرتی تھیں بلکہ صرف ان باتوں کا ذکر کرتی تھیں جو خوشگوار ہوتیں۔

قرۃ العین حیدر:

بنیادی طور پر میں امن پسند واقع ہوئی ہوں۔ دوسروں کے بارے میں ناخوشگوار باتوں کو دہرا کر پوری فضا کو ناگوار بنا دینا مجھے پسند نہیں۔ میری ذہنی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ میں صرف وہ باتیں یاد رکھتی ہوں جو زندگی کو خوشگوار بناتی ہیں۔ میں تو ان باتوں کو بھی فراموش کر دیتی ہوں جو کسی نے میرے بارے میں کہی ہوں۔ میرا کوئی ہم عصر جب بھی میری مخالفت میں کچھ کہتا ہے تو میں یہ طے کر لیتی ہوں کہ میں اسے کوئی مسئلہ نہیں بناؤں گی کیونکہ آگے چل کر یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا۔ ایسی باتوں سے خود کو آزردہ کیوں کروں جو میرے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتیں۔ اس سے دوسروں کی دل آزاری کے سوا کیا ہوگا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

ھاجرہ مسرور:

سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اس کا اپنی تحریروں میں ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ بھی بہرحال ہماری زندگی کا ایک رخ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یقیناً، ہمیں اس بات کا نوٹس لینا چاہیے تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے اس دورے کے کچھ عرصہ بعد کسی نے ایک نہایت بے ہودہ اور شر انگیز مضمون لکھا تھا۔ اس پر میرا ردِعمل کیا ہونا چاہیے تھا۔ کیا مجھے بھی چند پتھر پھینک کر مزید کچھ گندگی اپنے اوپر اچھالنے کا موقع فراہم

کرنا چاہیے تھا؟

ہاجرہ مسرور:

آپ خواہ جو بھی کہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ ہم چاروں (جمیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور) کے خلاف جس رویے کا مظاہرہ کیا گیا وہ شرمناک تھا۔ اس کا اظہار بعض تحریروں میں بھی کیا گیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ہمارے ایک ترقی پسند ادیب نے ہمارا حوالہ دے کر لکھا تھا کہ یہ ہندو، عیسائی یا یہودی تو بن سکتی ہیں، مسلمان نہیں کبھی نہیں۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ ہم چاٹگام میں ایک مندر کے اندر چلی گئی تھیں۔ یہ فتویٰ ان مرد ادیبوں کے خلاف صادر نہیں کیا گیا جو ہمارے ساتھ خود بھی مندر کے اندر گئے تھے۔ (اس مرحلے پر "ڈان" کے ایڈیٹر احمد علی خاں نے مداخلت کی اور کہا کہ وہ قرۃ العین حیدر سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں)۔

احمد علی خاں:

جنوبی ایشیا کے ادب میں آج جو مکاتیب فکر موجود ہیں، کیا آپ ہماری خاطر ان کی وضاحت کرنا پسند کریں گی۔ مثلاً بھارت کی علاقائی زبانوں جیسے بنگلہ وغیرہ میں کیا کچھ لکھا جا رہا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بنگلہ زبان کا ادب تو ہمیشہ سے بلند معیار رہا ہے۔

احمد علی خاں:

ترقی پسند تحریک کا کیا حال ہے۔ کسی زمانے میں یہ بڑی فعال تھی۔

قرۃ العین حیدر:

ترقی پسند ادب کی تحریک دم توڑ چکی ہے۔ پرانے قابل ذکر لوگوں میں اب صرف علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی رہ گئے ہیں۔ البتہ ہندستان کی مختلف زبانوں اور خصوصاً علاقائی زبانوں کے ادب میں بعض نئے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ایک تو مظلوم طبقوں کا ادب ہے جو ان کی بقا کی جدوجہد کا آئینہ دار ہے۔ ان لوگوں میں جن کو بھارت میں "دلت" کہا جاتا ہے، اپنے حقوق کا

شعور موجود ہے۔ پھر ان لوگوں کا ادب ہے جو سیاسی اور سماجی کام کے لیے کسی بھی جدوجہد میں براہ راست شریک رہے ہیں۔ اس حوالے سے تخلیق کیے جانے والے ادب کا بعض حصہ بے حد پُر اثر ہے۔ پھر علاقائی زبانوں مراٹھی، گجراتی، ملیالم اور سب سے بڑھ کر بنگلہ زبان کے ادب میں بڑی زندگی اور توانائی ہے۔ ہندی میں بھی کافی اچھا معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ ہندی کے افسانوں میں بڑی توانائی ہے۔ شاعری البتہ کمزور ہے۔ اس کے مقابلے میں اردو کی شاعری میں بڑی قوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں شاعری ہی پر زیادہ زور ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک میرے خیال میں مر چکی ہے۔ اس کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ چنانچہ اب اس تحریک سے وابستہ ادیب بھی تعداد میں کم ہیں۔

ھاجرہ مسرور:

افسانہ نگاروں یا شاعروں میں کچھ نئے ترقی پسند بھی پیدا ہوئے یا نہیں؟

قرۃ العین حیدر:

افسانے میں ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ اس میں کہانی پن کو واپس لایا جائے۔ یہ ان افسانہ نگاروں کا ردِ عمل ہے جو بہت زیادہ داخلیت پسند اور دقیق ہو گئے تھے۔ اب اس رجحان کے خلاف ردِ عمل عام ہے۔ مجموعی طور پر وہاں ہر قسم کا ادب تخلیق ہو رہا ہے اور ادیبوں کا ایک جم غفیر اس عمل میں مصروف ہے۔

ھاجرہ مسرور:

میرا خیال ہے کہ بھارت کی علاقائی زبانوں میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ اردو میں منتقل ہو رہا ہے۔ کیا اس کے برعکس بھی ہو رہا ہے اور اردو کی تحریریں بھی علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہو رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں، بہت کافی۔ اور خاص طور سے اردو کی شاعری کا کافی بڑا حصہ ہندی اور علاقائی زبانوں مثلاً گجراتی وغیرہ میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ گجراتی نے تو غزل کو اپنی ایک صنف ادب کے

طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ سرکاری ادارے نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایک باضابطہ پروگرام کے تحت ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان میں منتقل کیا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے پروگرام کے تحت ہورہا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے "آگ کا دریا" کا تمام تسلیم شدہ علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرایا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ آپ کو شاید علم ہوگا کہ انگریزی کو باضابطہ طور پر ایک مکمل ہندستانی زبان کے طور پر تسلیم کیا جاچکا ہے۔ انگریزی صحافت اور خاص طور سے مجلاتی صحافت کا معیار بھی بہت بلند ہے۔ بیشتر ہندستانی جو انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور جنھوں نے کافی شہرت حاصل کرلی ہے ہندستان میں نہیں ہیں بلکہ ملک سے باہر رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہندستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی غیر اہم زبانیں جنھیں کوئی جانتا بھی نہیں تھا، اب ادب پر اثر انداز ہورہی ہیں۔ مثال کے طور پر مائتلی، کونکنی، نیپالی، گورکھالی (ایک ذیلی علاقائی ثقافت کی نمائندہ) وغیرہ کا اثر ادب پر پڑا ہے۔ البتہ میں ایک بڑی ہی غیر منظم قسم کی ادیبہ ہوں اور اپنی تصانیف کو فروغ دینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتی۔ کاش میں اپنے ناول کا انگریزی میں ترجمہ کرکے ان کو شایع کراسکتی۔ میں یہ سب کچھ نہیں کرسکتی کیونکہ میری کوئی تنظیم نہیں ہے اور میں بہت کاہل بھی ہوں۔ البتہ "السٹریٹیڈ ویکلی" کی ملازمت کے دوران میں نے کام بہت کیا۔ صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک مجھے دفتر میں بیٹھنا پڑتا تھا اور مقررہ اوقات پر کام کرکے دینا ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے انگریزی میں میری تحریریں کم شایع ہوئیں۔ میں نے خالد انصاری کے "سنڈے مڈڈے آف بمبئی" کے لیے ایک کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر وہ سلسلہ بھی میں نے بند کردیا۔

ھاجرہ مسرور:

بھارت میں اردو کا کیا مستقبل ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اردو کی جنگ تو اترپردیش میں لڑی جارہی ہے جہاں اسے دوسری زبان کے طور پر تسلیم تو کرلیا گیا ہے لیکن اس فیصلے پر ابھی تک عمل درآمد نہیں ہوا ہے۔ ورنہ بھارت کے بہت سے علاقوں

میں اردو دوسری سرکاری زبان کے طور پر کام کر رہی ہے۔ ان میں بہار، ہماچل پردیش، آندھرا اور مہاراشٹر کے صوبے شامل ہیں۔ اردو پہلی زبان ہے۔ پورے ہندستان کے لاکھوں اسکولوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ جہاں کہیں بھی اردو کا کسی علاقائی زبان سے تصادم نہیں ہے وہاں یہ پوری توانائی کے ساتھ زندہ ہے۔ اتر پردیش میں اردو کا تصادم براہ راست ہندی سے ہے۔ مغربی بنگال میں بھی اردو پوری قوت سے زندہ ہے اور بے شمار اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ حال ہی میں دہلی میں کتابوں کی ایک نمائش ہوئی تھی جہاں مغربی بنگال کے پویلین میں ایک پورا سکشن اردو کی کتابوں کے لیے مخصوص تھا۔ جب سے مارکسسٹ حکومت برسر اقتدار آئی ہے تب سے مغربی بنگال میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

هاجره مسرور:

اردو کے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

قرة العين حيدر:

یہ کیوں کر ممکن ہے؟ اردو اسے اس کا رسم الخط چھین لینے کے بعد زبان میں باقی کیا رہ جائے گا۔ اس طرح تو اردو کے تشخص اور اس کی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ اگر آپ چینی زبان سے اس کا رسم الخط چھین لیں تو پھر اس میں باقی کیا بچے گا۔ جو لوگ اردو زبان تبدیل کرنے کی بات کرتے ہیں وہ اردو الفاظ کے مخرج و ماٰخذ اور ان کی معنوی ساخت کا بھرپور علم نہیں رکھتے۔ اردو صرف اسی وقت تک زندہ رہے گی جب تک اس کا موجودہ رسم الخط باقی ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اردو سیاست کا شکار ہو گئی ہے اور سیاست کی دکان چمکانے کے لیے یہ ایک اچھا حربہ ہے۔

(’قومی زبان‘ کراچی، جون 1989)

آئینہ جہاں برصغیر کی ممتاز اور منفرد فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی کلیات ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا افسانوی سفر 1943 سے شروع کیا۔ جو ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے تقریباً 75 افسانے لکھے جو ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔ پانچ ناولٹ، نو ناول اور گیارہ رپورتاژ تحریر کیے۔ ان کے علاوہ درجنوں مضامین، خاکے، بچوں کی کہانیاں اور دوسری زبانوں سے تراجم کیے۔ پوری زندگی صحافت میں گزاری (پرنٹ میڈیا اور الکٹرونک میڈیا) درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں۔ مصوری اور موسیقی کا بھی بے حد شوق تھا۔ درجنوں پینٹنگ بنائی لندن اور ہندوستان میں نمائش بھی ہوئی۔ انگریزی میں سیکڑوں صحافتی مضامین لکھے انٹرویوز اور فلم ریویو کیے، اردو ادیبوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خود درجنوں انٹرویو دیے۔ محقق کا فریضہ بھی انجام دیا اور کئی کتابیں مدون کیں۔ یہ کلیات ایک عہد ساز ادیبہ کے کارناموں کو مجتمع کرنے کی ایک محققانہ کوشش ہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''پدم شری'' اور ''پدم بھوشن'' جیسے انعامات سے سرفراز کیا تھا۔ جلد دہم ان کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ادیب، محقق، مصنف اور نقاد ہیں۔ فکشن کی تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کلیات اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس سے قبل بلونت سنگھ کی کلیات آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کا نیا افسانوی مجموعہ بھی ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اشاریہ آج کل کی تدوین کے ذریعے اردو میں اشاریہ سازی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ زندگی نامہ قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ ان کے علمی کمالات کے نئے زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کی داستان بہت طویل ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی چالیس سے زائد کتابیں قومی اور بین الاقوامی اداروں سے شائع ہو چکی ہیں جن میں چار کتابیں آکسفورڈ پریس سے بھی شائع ہوئی ہیں اور انھیں کئی ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-128-9
9 789351 601289
NCPUL
New Delhi
₹ 128/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025